ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۱۶/ جنوری ۹۶ء

☆ عوام کی اکثریت رفاہ پارٹی کو نجات دہندہ خیال کرتی ہے : واقعات عالم

☆ سرد جنگ کے بعد امریکہ کا کردار ختم ہو کر رہ گیا ہے؟ : بدلتے افق

☆ "اسلحہ یا رائے عامہ" کے علاوہ انقلاب کا تیسرا راستہ بھی ہے : افہام و تفہیم

حدیث امروز

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

چال بے ڈھنگی

روزنامہ "جنگ" نے چند روز پہلے پنجاب یونیورسٹی کے حالیہ امتحانات کے حوالے سے خبر دی کہ بی کام پارٹ ون کے "اسلامیات" اور "مطالعہ پاکستان" سمیت پانچ پیپر آؤٹ ہو چکے ہیں۔ پیپر آؤٹ ہونے کے عمل کے بارے میں ایک واقف حال نے بتایا کہ امتحان کے روز سے ایک رات قبل رات بارہ بجے کے بعد پیپر کی کاپی مل جاتی ہے جس کے لئے کوئی تین چار لاکھ روپے کی ادائیگی کرنا ہوتی ہے۔ عموماً دو سو کے لگ بھگ طلبہ فی کس ڈیڑھ دو ہزار روپے دیتے ہیں۔ اگلی صبح یہی طلبہ امتحان سے پہلے پانچ سو روپے کے عوض تین چار سوال فی طالب علم بتا دیتے ہیں۔ ایک پیپر کے بارے میں دلچسپ صورتحال کا انکشاف ہوا۔ امتحان ہال میں جو پیپر تقسیم ہوا وہ اس پیپر سے بالکل مختلف تھا جس کی کاپی گئی رات تین لاکھ کے عوض دی گئی تھی۔ طلبہ نے یہ الزام لگا کر امتحان کا بائیکاٹ کر دیا کہ پیپر پڑھائے گئے کورس سے باہر ہے۔

یوں تو زندگی کے کسی بھی شعبے میں بدعنوانی بالآخر اجتماعی ترقی پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی مگر شعور' تہذیب اور کردار سنوارنے کا ذمہ دار اعلیٰ تعلیمی ادارہ اگر خود ہی بددیانتی کا مرتکب ہو اور قوم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ سپوت ایسے شرمناک فعل پر مصر ہوں تو ہمارے مجموعی کردار سے اچھائی کا نظر نہ آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ویسے تو تعلیمی میدان میں بگڑتی ہوئی صورت حال سے قوم واقف ہی ہے بلکہ برابر کی حصہ دار ہے مگر انہی دنوں سینٹ کے چیئرمین اور وفاقی انٹی کرپشن کمیٹی کے چیئرمین ملک قاسم کے حوالے سے ایک غیر متوقع خبر نے انتہائی پریشان کر دیا کہ "پنجاب پبلک سروس کمیشن کے پرچوں کی بھی لوٹ سیل لگی ہوئی ہے"۔ اور ایک اور خبر بھی تھی کہ "پنجاب پبلک سروس کمیشن کے اہلکاروں نے اپنے ہرکارے رکھ لئے ہیں جو امیدواروں کے گھروں پر جا کر مکا کرتے ہیں۔ ۴۰ ہزار سے ۹۰ ہزار روپے تک نذرانہ طلب کیا جاتا ہے"۔

انہی دنوں ایک مقامی اخبار میں ایک ہی روز کی چند سرخیاں ملاحظہ فرمایئے۔ "سرگودھا کے قریب کوچ اور ویگن میں خوفناک تصادم ۱۷ جاں بحق' ۱۱ زخمی۔ بہت سے زخمیوں کی ٹانگیں' بازو اور ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ حادثہ تیز رفتاری کے باعث پیش آیا"۔ "محنت کش کی ماں بہن اور تین بھانجیوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا"۔ "ڈانٹا کیوں۔ سنگدل بیٹے نے بوڑھے باپ کو چھری سے ذبح کر دیا"۔ "لاہور۔ مختلف مقامات پر تین افراد قتل کر دیئے گئے"۔ "سابق ایم پی اے ۱۳ سالہ ملازمہ کے اغوا کے الزام میں گرفتار"۔ "سابق انکم ٹیکس کمشنر نے خزانے کو ۴۵ لاکھ کا نقصان پہنچایا"۔ دو تین روز بعد یہ خبریں بھی شائع ہوئیں۔ "لاہور ایئرپورٹ پر دو کروڑ کی ہیروئن پکڑی گئی"۔ "لوگ چالیس سے پچاس فیصد تک بیمار' لاغر اور مردہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں"۔ یہ خبریں پیش کرنے کے لئے کسی خاص دن یا کسی خاص اخبار کو تلاش نہیں کیا گیا بلکہ یہ معمول کی خبریں ہیں۔ لوگ ایسی خبریں پڑھنے یا سننے کے عادی ہو چکے ہیں بلکہ اپنی مجموعی زندگی کا عکس دیکھنے سے محظوظ ہوتے ہیں اور یوں غلط کام کرنے کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹیلی ویژن پر معروف دانشوروں کے لکھے ہوئے ڈرامے سبق آموزش کے پردے میں فحاشی خوب پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام اکابرین قوم (سیاستدان' دانشور' علماء کرام) کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے کہ قوم نے مجموعی طور پر بے ڈھنگی چال اختیار کر لی ہے۔ غلط کام کرنے میں لطف آتا ہے' قانون شکنی کو جواں مردی کہا جاتا ہے' کرپشن کو مجبوری کا نام دیا جاتا ہے' رشوت کو نذرانہ سمجھتے ہیں' بداخلاقی کو لبرل ازم کہتے ہیں' بے حیائی کو جدیدیت قرار دیتے ہیں' بدعہدی کو حکمت عملی کہتے ہیں' گالی دے کر خوش ہوتے ہیں' غیبت سے قلبی سکون ملتا ہے۔

آیئے قرآن کریم سے دلی تعلق جوڑنے والے مہینے رمضان المبارک کے استقبال میں اپنی خطاؤں سے گریز کرنے کا عہد کریں کہ شاید بگڑی بن جائے۔OO

قیمت : ۸ روپے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دعویٰ کرتے ہیں منکر کہ وہ ہرگز دوبارہ نہ اٹھائے جائیں گے' ان سے کہو' نہیں' میرے رب کی قسم' تم ضرور اٹھائے جاؤ گے' پھر تمہیں ضرور بتادیا جائے گا کہ تم نے کیا کچھ کیا ہے' اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے○

(ان مشرکین مکہ کے جواب میں جو پوری ڈھٹائی سے آخرت کے وقوع کا انکار کرتے تھے اور کسی عقلی و منطقی دلیل کے سننے کے روادار تک نہ تھے' "الصادق والمصدوق" ہستیؐ سے وقوع آخرت کے اثبات پر قسم دلوائی جارہی ہے جس کی صداقت اور امانت کا لوہا بدترین مشرک بھی ماننے پر مجبور تھے' اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے درمیان اس پیکر صدق و صفا نے چالیس برس گزارے تھے' ان سے بہتر اس کی صداقت پر گواہ اور کون ہو سکتا تھا!)

پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا' اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے○

(کتنے زوردار انداز میں ایمان کی دعوت دی جارہی ہے کہ قرآن کی آیات بینات تمہارے سامنے ہیں' توحید رسالت اور آخرت کا مضمون نکھر کر سامنے آچکا ہے تو اب دیر کس بات کی ہے! قدم آگے بڑھاؤ' کائنات کی ان صداقتوں کو قبول کرنے کی جرات اپنے اندر پیدا کرو جن کی گواہی تمہارے اپنے باطن میں موجود ہے' اور ہاں خبردار تم جو کچھ کر رہے ہو سب اللہ کے علم میں ہے)

حافظ عاکف سعید

جس دن وہ تم کو اکٹھا کرے گا جمع ہونے کے دن' وہ دن ہے ہار جیت کا'

(ہار جیت کا اصل فیصلہ تو اس دن ہو گا' دنیا کی ہار جیت کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں' فی الواقع کامیاب وہی ہو گا جو اس دن کامیاب قرار پائے گا اور جو وہاں ناکام قرار دے دیا گیا وہ دنیا میں خواہ کتنا کامیاب و کامران رہا ہو' حقیقت کے اعتبار سے اس سے بڑا ناکام اور نامراد اور کوئی نہ ہو گا)۔

اور جو اللہ پر ایمان لایا ہے اور نیک عمل کرتا ہے' اللہ اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ لوگ ہمیشہ ہمیش اس میں رہیں گے اور یہی ہے بڑی کامیابی○

(کہ کامیابی تو صرف انہی کے قدم چومے گی جو اللہ پر ایمان لائیں گے اور اپنی زندگیوں کو نیک اعمال سے مزین کریں گے۔ انہی اہل ایمان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انہیں بہترین انعامات سے نوازے گا)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہی لوگ ہیں دوزخ والے' جو ہمیشہ اس میں رہیں گے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے○

(اور ناکامی ان لوگوں کا مقدر بنے گی جنہوں نے اس دنیا میں اللہ کا اور اس کی آیات یعنی قرآن کا انکار کیا' وہ ہمیشہ کے لئے آگ میں جھونک دیئے جائیں گے اور نافرمانوں کا انجام اس کے سوا ہو بھی کیا سکتا ہے!)

(سورۃ التغابن' آیات ۷ تا ۱۰)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۳
۱۶/ جنوری ۱۹۹۶ء

2

مدیر : حافظ عاکف سعید
معاون مدیر : نثار احمد ملک

یکے از مطبوعات
تحریک خلافت پاکستان
۴ ۔ اے' مزنگ روڈ' لاہور

مقام اشاعت
۳۶ ۔ کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور
فون : ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

پبلشر : محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری
مطبع : مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ : ۸ روپے
سالانہ زر تعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

زر تعاون برائے بیرون پاکستان
☆ ترکی' اومان' مصر ۱۳/ امریکی ڈالر
☆ سعودی عرب' کویت' بحرین' قطر' عرب امارات' بھارت' بنگلہ دیش' یورپ' جاپان ۲۰ امریکی ڈالر
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

حال ہی میں عالمی افق پر غیر متوقع طور پر دو ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کے باعث عالم اسلام پر ہر طرف چھائے مایوسی اور ناامیدی کے گھرے سیاہ بادلوں میں سے امید کی ایک ہلکی سی کرن نمودار ہوئی ہے۔ ایک کا تعلق ترکی کے حالیہ انتخابات سے ہے جہاں نجم الدین اربکان کی رفاہ پارٹی حالیہ انتخابات میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ ہفت روزہ "ٹائم" کے تازہ پرچے میں اس پر جو رپورٹ نما تبصرہ شائع ہوا ہے' اس کا ترجمہ زیر نظر شمارے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی میں خلافت کے خاتمے کے بعد غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ سیاسی سطح پر خالص اسلام کے نام پر ایک جماعت کو پذیرائی حاصل ہوئی ہے ورنہ اس سے پہلے وہاں اجتماعی زندگی میں اسلام کے کسی عمل دخل کا کوئی امکان بھی نہ تھا۔ سیکولر جمہوریت اور مغربی طرز معاشرت کے ڈنکے بج رہے تھے' یہاں تک کہ آئینی طور پر سیکولر جمہوریت کے خلاف بات کرنا جرم شمار کیا جاتا تھا۔

دوسری اہم تبدیلی کا تعلق سعودی عرب سے ہے جہاں کے فرمانروا شاہ فہد نے اپنی علالت کے سبب شہزادہ عبداللہ کو عارضی طور پر اقتدار کی منتقلی کا اعلان کیا ہے۔ اس ضمن میں اس سے قبل بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے لیکن شاہ فہد کے اس اقدام سے بظاہر احوال اب وہ اندیشے اپنی موت مر چکے ہیں۔ ہم شاہ فہد کی صحت اور تندرستی اور شہزادہ عبداللہ کی کامیابی دونوں کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں اور امید کرتے ہیں کہ شہزادہ عبداللہ' جو امریکہ اور یہود کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے' حسب توقع سعودی عرب اور عالم اسلام کو یہودیوں کے پنجے سے نجات دلانے میں اپنا اہم کردار ادا کرنے میں کامیاب ثابت ہوں گے۔

مسلم دنیا میں سعودی عرب اور ترکی کو دو مختلف انتہاؤں کے لحاظ سے خصوصی اہمیت ہے۔ خادمین حرمین شریفین کی حیثیت سے سعودی حکمران خاندان کو مسلمانوں میں "مذہبی" لحاظ سے جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ دوسری کسی مسلمان حکومت کو حاصل نہیں ہو سکتا' مگر بدقسمتی سے خلیج کی جنگ کے نتیجے میں سعودی سرزمین پر امریکی افواج کی موجودگی کے باعث' جو تاحال برقرار ہے' عالم اسلام میں سعودی حکومت کا وہ خصوصی مقام و مرتبہ بری طرح مجروح ہوا ہے۔ اگر شہزادہ عبداللہ کی قیادت میں سعودی حکومت اس کی تلافی کی کوشش کرتی ہے تو اس سے صرف سعودی عرب اور اس کی حکومت ہی کو نہیں پوری مسلم امہ کو تقویت حاصل ہو گی۔

حرمین شریفین کی بدولت سعودی عرب کو اگر امت مسلمہ کے دینی و مذہبی مرکز کی حیثیت حاصل ہے تو رواں صدی کے اوائل تک ترکی کو امت مسلمہ کے سیاسی مرکز کی حیثیت حاصل تھی جو غیروں کی عیاری اور اپنوں کی نادانی کے باعث ۱۹۲۴ء میں جاتی رہی۔ صرف یہی نہیں خلافت کے خاتمہ کے بعد ترکی نے سیکولر جمہوریت اور مغربی معاشرت کو اپنا قبلہ قرار دے کر بالکل مخالف سمت میں قومی سفر کا آغاز کیا جس کا نصف صدی کا حاصل ملکی سطح پر افراط زر اور قرضوں کا بوجھ اور معاشرتی سطح پر جنسی بے راہروی ہے۔ ان حالات میں ایک اسلام پسند سیاسی جماعت کی انتخابات میں کامیابی بلاشبہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس سے امید پیدا ہوئی ہے کہ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس سرزمین کو پھر سے اسلام کی خدمت کے لئے منتخب فرما لے۔

مغرب' جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے' اسلام مخالف ریشہ دوانیوں میں تمام حدود و قیود پس پشت ڈال چکا ہے۔ امریکہ کی پشت پر یہودی سرمایہ دار ہیں اور مشرق و مغرب بالفعل اس وقت یہود کی معاشی غلامی میں جکڑے جا چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب اپنی صنعتی اور سائنسی ترقی کے بل پر دنیا میں کھڑا نظر آ رہا ہے جبکہ مسلم ممالک صدیوں کی پسماندگی اور ذہنی غلامی کی وجہ سے اور بالخصوص اللہ کے دین سے بے وفائی کے باعث تاحال دنیا میں کوئی قابل ذکر مقام حاصل نہیں کر سکے۔ اور وہ پورے طور پر نیو ورلڈ آرڈر کے چنگل میں ہیں۔ مسلمانانِ عالم گو انتہائی پستی میں ہیں اور بحیثیت مجموعی بے چارگی اور لاچاری کی تصویر بنے ہوئے ہیں لیکن اسلام بہرحال ایک زندہ قوت ہے۔ چنانچہ اسلام ہی چونکہ وہ واحد مذہب ہے جو دنیا کو ایک "نظام عدل اجتماعی" دے سکتا ہے لہٰذا صیہونی طاقتیں اسلام کے احیاء میں صاف طور پر اپنی موت دیکھتی ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ پیسہ اور ذہن یہودیوں کا ہے اور تباہ کن عسکری ساز و سامان کے انبار امریکہ اور یورپ میں جمع ہیں اور یہ سب مل جل کر اسلام کا راستہ روکنے میں سرگرم عمل ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے کہ دنیا میں جبر و استبداد کا دور اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ گو یہ کہنا مشکل ہے کہ اس تاریک رات کے چھٹنے میں ابھی مزید کتنا عرصہ لگے گا لیکن "بتا رہی ہے یہ ظلمت شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے"۔ OO

عوام کی اکثریت رفاہ پارٹی کو نجات دہندہ خیال کرتی ہے

انتخابات کے بعد فوج نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ مسلم بنیاد پرستی کو ابھرنے سے روک دیں گے

اربکان بنیاد پرست انقلاب کے حق میں نہیں' وہ صرف ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں

ترکی کے انتخابات میں رفاہ پارٹی کی کامیابی پر بین الاقوامی جریدے "ٹائم" کا تبصرہ

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

نجم الدین اربکان دیکھنے سے کسی طرح بھی مسلم سیاست کے کھلاڑی نظر نہیں آتے۔ ۶۹ سالہ ترک راہنما عدل پر مبنی معاشی نظام چاہتے ہیں۔ خوبصورت سوٹ میں ملبوس' ہنس مکھ اربکان نے جرمنی کے ٹیکنیکل کالج سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کیا تھا اور یورپی مراکز اور وہاں کے رہن سہن سے آشنا ہیں۔ لیکن جب وہ سیاسی معاملات پر زبان کھولتے ہیں تو اعتدال پسند ترکوں اور مغربی راہنماؤں پر خوف سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اپنی رفاہ پارٹی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی پارٹی ہے۔ رفاہ پارٹی' جو ایک مسلم تحریک ہے' گزشتہ ہفتے سامنے آنے والے انتخابی نتائج کے مطابق ترکی میں سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اربکان بڑے اعتماد سے کہتے ہیں کہ کوئی ہمارا راستہ نہیں روک سکتا۔ ہم ایک اسلامی کامن مارکیٹ' ایک اسلامی یو۔ این۔ او' ایک عالمی اسلامی یونین قائم کریں گے۔ اربکان' جنہیں ترکی میں ساٹھ لاکھ کے قریب ووٹروں کی حمایت حاصل ہے' نیٹو (NATO) سے علیحدگی اور ترکی میں امریکی ہوائی اڈے بند کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم کسی کے غلام نہیں ہیں کہ ترکی یورپی یونین کے فیصلوں کا پابند ہو' لہٰذا ان کا حالیہ کسٹمز سمجھوتہ قبول نہیں کریں گے۔ وہ سود کا مکمل خاتمہ' پی۔ ایل۔ او اسرائیل امن تصفیہ کی مخالفت اور عراق کے خلاف یو۔ این۔ او کی طرف سے عائد کردہ پابندیاں ختم کرانا چاہتے ہیں' وہ کہتے ہیں کامیاب ہو کر ہم آئین کی دفعہ ۲۴ میں ترمیم کر دیں گے' جس کے تحت جدید ترکی کے بانی کمال اتاترک کے عطا کردہ سیکولرزم کو تقدس کا درجہ دے دیا گیا۔

رفاہ پارٹی کو ۲۴ دسمبر کو ہونے والے انتخابات میں جن وعدوں کا بنا پر ۲۱.۳ فیصد ووٹ ملے ہیں ممکن ہے وہ درحقیقت انقلابی نظریات کی بجائے محض انتخابی ہوں' لیکن انہوں نے ایک بار اعتدال پسند ترکوں کو پریشان ضرور کر دیا ہے۔ استنبول کی ایک خاتون وکیل سیون ایاس (Sevin Ayas) نے اسلام پسندوں کی انتخابات میں کامیابی کا سن کر صدمے کا اظہار کیا اور کہا کہ میرا سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ وزیراعظم تانسو شیلر کی بھی یہی کیفیت ہوگی جنہوں نے اکتوبر کے آخر میں کم وقت کے نوٹس پر انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اب رفاہ پارٹی کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے تو اسے حکومت سے باہر رکھنے کے لئے باقی جماعتیں آپس میں گٹھ جوڑ کر رہی ہیں۔ وقتی طور پر اس سے کام تو چل جائے گا کیونکہ دائیں بازو کی دو بڑی پارٹیوں' یعنی تانسو شیلر کی "راہ حق پارٹی" (True Path Party) اور ان کے سیاسی حریف مسعود یلمز (Mesut Yilmaz) کی مدر لینڈ پارٹی نے مجموعی طور پر ۴۰ فیصد ووٹ حاصل کئے ہیں۔ لیکن یہ ملی بھگت تادیر قائم رہنے والی نہیں' نہ ہی یہ اس قابل ہوگی کہ ملک کے ان گنت سیاسی' معاشی اور فوجی امراض کا علاج کر سکے۔ شیلر اور یلمز کو جو ایک دوسرے کو کھلم کھلا تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں ۸۴ فیصد افراط زر' ۱۰۰ بلین ڈالر کے قرضے اور کرد علیحدگی پسندوں کے خلاف گیارہ سالہ لاقتاہی جنگ جسے ۷ بلین ڈالر کے سالانہ اخراجات اور سینکڑوں ہلاکتوں کے باوجود جیتنے کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا' جیسے شدید ترین مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔

ہمبرگ' جرمنی کی اورینٹ انسٹی ٹیوٹ کے اڈو شین باش (Udo Steinbach) خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ترکی میں اگر مخلوط حکومت قائم ہوئی تو اس کا چلنا محال ہوگا کیونکہ اگر سنجیدگی سے معاشی مسائل حل کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا منفی اثر ملازمتوں پر پڑے گا' جس سے رفاہ پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ملک کا استحکام اور ترقی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ترکی نیٹو کا اہم جنوبی گڑھ اور امریکہ کا قریبی ساتھی ہے۔ سرد جنگ کے دوران ترکی میں موجود مراکز کے ذریعے امریکہ کو روس پر نظر رکھنے کا موقعہ ملا۔ انہی مراکز کو خلیج کی جنگ میں عراق پر ہوائی حملوں کے لئے استعمال کیا گیا اور شمالی عراق پر یو۔ این۔ او کی طرف سے عائد ہوائی پروازوں پر پابندی عمل میں لائی گئی ہے۔ مزید برآں بوسنیا میں نیٹو کی کامیابی کا انحصار بھی ترکی کی عملی شرکت پر ہے جہاں بوسنیا کو فوجی تربیت اور مسلح کرنے کا بیشتر کام اسے انجام دینا ہے۔

تجزیہ نگار اس بارے میں کوئی پیشگوئی کرنے سے ہچکچا رہے ہیں کہ بنیاد پرستوں کی طرف سے متشددانہ کارروائیاں شروع ہونے کا امکان ہوگا یا بالآخر اربکان کی رفاہ پارٹی اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ ترکی کی جمہوریت پسندی اور مسجد اور ریاست کے الگ الگ رکھنے کی اپنی ایک ۵۰ سالہ تاریخ ہے۔ رفاہ پارٹی کی کامیابی کے باوجود ووٹروں کی ۸۰ فیصد تعداد سیکولرزم کی دلدادہ ہے جو ملک کی اکثریتی جماعتوں کا مطمح نظر ہے۔ انقرہ میں مقیم ایک مغربی سفارت کار کا کہنا ہے کہ ترکی کو ایران یا الجزائر پر قیاس نہیں کرنا چاہئے۔ یہ واحد مسلمان ملک ہے جس کی معیشت نہایت اعلیٰ درجے پر پروان چڑھی

ہے اور جہاں سیکولر جمہوریت کی جڑیں اتنی گہری ہوئی ہیں۔ ترکی نے اپنی سمت یورپ اور عالمی مارکیٹ اکانومی کی طرف متعین کر رکھی ہے۔ اگر سیاستدان ملک کو اس راستے پر چلانے میں ناکام رہے تو اس کام کے لئے مضبوط فوجی قیادت موجود ہے۔ انتخابات سے قبل اور بعد میں فوجی افسروں نے صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ مسلم بنیاد پرستی کو ابھرنے سے روک دیں گے۔ فوج کے چیف آف سٹاف جنرل اسمٰعیل حقی کرادائی (Ismail Hakki Kardayi) کا کہنا ہے کہ ترک افواج اصلاحی عمل جاری رہنے کی حامی ہیں لہٰذا اس عمل کے خلاف کسی قسم کا باگل پن برداشت نہیں کیا جائے گا۔ یاد رہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد فوج تین مرتبہ ملک کی عنان اقتدار پر قابض رہ چکی ہے۔

اربکان کی اپنی شخصیت میں بھی امید کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ اپنے معرکہ خیز خطابات کے باوجود ان کے سیاسی رجحانات مشرقی طرز کے جہاد کے ہمنوا سے زیادہ مغربی طرز کے کرسچین ڈیموکریٹ سے میل کھاتے ہیں۔ وہ پہلے ترک ہیں جنہوں نے جنگ عظیم دوم کے بعد جرمنی میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد وہاں ملازمت میں رہے۔ ترکی واپس آ کر کاروبار شروع کیا۔ کچھ عرصہ ترکی کی یونین آف چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر رہے۔ بعد ازاں سیاست میں داخل ہوئے اور کونیا (Konya) کے قدامت پرست قصبے سے پارلیمنٹ کا انتخابات جیتا۔ ۱۹۷۰ء میں اسلام کے مقاصد کے حصول کے لئے نیشنل آرڈر پارٹی قائم کی۔ لیکن ان کے قریبی ساتھیوں کا کہنا ہے کہ وہ بنیاد پرستانہ انقلاب کے حق میں نہیں' وہ صرف ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینا چاہتے ہیں' اسلامی ریاست قائم کرنا ان کے پیش نظر نہیں۔ اگرچہ اربکان کے مداحوں میں بہت سے قدامت پسند کاروباری حضرات ایسے ہیں جو معیشت اور سیاست میں اسلام کا عمل دخل جائز سمجھتے ہیں۔

بہرحال اکثر لوگوں کی رائے ہے کہ آنے والی مخلوط حکومت میں رفاہ پارٹی کو شامل کیا جانا چاہئے تاکہ اس کا اعتدال پسند مرکز متعصب حاشیہ برداروں کے ہاتھوں میں نہ چلا جائے' خصوصاً ان حالات میں جبکہ دیگر تمام سیاسی جماعتیں بدعنوانی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہیں' عوام کی اکثریت رفاہ پارٹی کو نجات دہندہ خیال کرتی ہے۔ صدر سلمان ڈیمرل کے سابق مشیر اعلیٰ' عمر ترکان کا کہنا ہے کہ سابقہ حکومت کے طرز حکمرانی کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوئی ہے کہ اس سے

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

تبلیغی بھائیوں کے نام ---- نصح و خیر خواہی کا پیغام

تحریر : نعیم اختر عدنان

اللہ تبارک تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے اس دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ایک لاکھ سے زائد پیغمبر مبعوث فرمائے۔ بعد ازاں حضورؐ کو ختم نبوت کا بے مثل اعزاز عطا فرما کر دین کی حفاظت' شریعت کے احکام کے نفاذ و اجراء اور دین کی تبلیغ و اشاعت جیسے اہم ترین فرائض کی ادائیگی "امت مسلمہ" کے ہر فرد کے ذمہ لگا دی۔

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے برصغیر کے مسلمانوں کو خصوصی مقام' اہمیت اور مرتبہ حاصل ہے۔ اسلام کے احیاء و تجدید کے حوالے سے برصغیر کی گزشتہ چار سو سالہ تاریخ اس امر پر شاہد ہے۔ مجدد الف ثانی' شاہ ولی اللہ' شاہ اسماعیل شہید' سید احمد بریلوی شہید' مولانا حسین احمد مدنی' شیخ الہند' مولانا محمود الحسن دیوبندی' مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی' علامہ اقبال اور مولانا الیاس رحمہم اللہ جیسی مقدس و محترم ہستیوں کا نام اور کام محتاج تعارف نہیں۔

آج سے نصف صدی قبل مجدد تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاسؒ نے دین کی دعوت و تبلیغ کی غرض سے ایک کام کا آغاز کیا۔ دین کی محنت پر مبنی یہ کام وسعت پذیر ہو کر آج مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں یکساں طور پر جاری و ساری ہے' جسے آج "تبلیغ کی محنت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' اور دنیا میں اس تحریک کو تبلیغی جماعت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مولانا الیاسؒ کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ لاکھوں نہیں کروڑوں انسان ان سے محبت و عقیدت کا تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا الیاسؒ نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق اور کھویا ہوا مقام و مرتبہ پھر سے حاصل کرنے کی عملی جدوجہد پر ابھارا ہی نہیں بلکہ عملاً اس میں لگا بھی دیا۔ امت مسلمہ کو دین کی تبلیغ اور ایمان کی محنت کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لئے مولانا الیاسؒ نے اپنے جلیل القدر ساتھی اور خلیفہ مجاز مولانا احتشام الحسن کاندھلویؒ کو طرز تبلیغ اور اس کی ضرورت و اہمیت کو کتابی شکل میں لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ انہوں نے "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع رسالہ مرتب کیا۔ اسی طرح شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نے بھی مولانا الیاسؒ کے حکم پر تبلیغ کی اہمیت اور اس کے آداب نیز مبلغین اور عام لوگوں کے فرائض سمجھانے کے لئے "فضائل تبلیغ" کے عنوان سے ایک کتابچہ مرتب کیا۔ اسی مقصد کے لئے مولانا نے کئی ایک رسائل مرتب کئے جن میں فضائل قرآن مجید' فضائل رمضان' فضائل نماز' فضائل ذکر' فضائل صدقات' فضائل درود شریف اور حکایات صحابہ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا تمام مضامین پہلے "تبلیغی نصاب" کے نام سے طویل عرصہ تک یکجا شائع ہوتے رہے۔ کئی سال پہلے تبلیغی جماعت کے اکابرین نے تبلیغی نصاب کا نام بدل کر فضائل اعمال رکھ دیا۔ "فضائل اعمال" کے عنوان سے چھپنے والی کتاب میں سے فضائل درود اور "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" نامی دو ابواب نکال دیئے گئے' یوں "فضائل اعمال" کی کتاب متذکرہ بالا دونوں ابواب سے خالی ہے۔

دینی نصرت و حمیت اور نصح و خیر خواہی کے جذبے سے تبلیغی بھائیوں کی خدمت میں خلوص و اخلاص پر مبنی گزارش و استدعا ہے کہ "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" کے عنوان سے قلمبند کئے جانے والے مضمون کو ملاحظہ فرمائیں' اس پر غور و فکر کریں' پیش نظر مقاصد و اہداف اور اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں۔ اسی مضمون میں سورۃ الصف کی آیات کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی "حق تعالیٰ نے ہم سے دو چیزوں کا مطالبہ کیا' اول یہ کہ ہم خدا اور رسولؐ پر ایمان لائیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کریں' اور اس کے بدلے میں دو چیزوں کی ہمیں ضمانت دی۔ آخرت میں جنت اور دنیا میں نصرت و کامیابی۔ پہلی چیز جو ہم سے مطلوب ہے وہ ایمان حقیقی ہے۔ ظاہر ہے ہماری اس تحریک کا منشاء بھی یہی ہے کہ ہمیں حقیقی ایمان کی دولت نصیب ہو۔ دوسری چیز جو ہم سے مطلوب ہے وہ جہاد ہے۔ جہاد کی اصل اگرچہ کفار کے ساتھ جنگ اور مقابلہ ہے مگر در حقیقت جہاد کا منشا بھی اعلائے کلمہ اللہ اور احکام خداوندی کا نفاذ و اجراء ہے اور یہی ہماری تحریک کا مقصد اصلی ہے۔"

اسلام کے کلمہ کی سربلندی' احکامات خداوندی کا نفاذ و اجراء اور روئے زمین پر خلافت کے قیام کی جدوجہد یہ سب کچھ امت مسلمہ کے فرائض میں شامل ہے جسے مولانا الیاسؒ کے خلیفہ مجاز نے خود اپنے مرشد کے حکم سے تحریر کیا۔ تبلیغی بھائیو اگر یہ کیا ستم ہوا کہ متذکرہ بالا فرائض کی "یاددہانی" والا حصہ تبلیغی نصاب سے خارج کر دیا گیا۔ ملت اسلامیہ کو موجودہ زبوں حالی اور زوال سے نکالنے کے لئے یہی سبق ضروری تھا جسے بھلا دیا گیا۔

"تنظیم اسلامی" نے اپنے ہم وطن اور ہم مذہب بھائیوں کی یاددہانی کے لئے "مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج" نامی مضمون محدود پیمانے پر شائع کیا ہے' حاصل کیجئے' پڑھئے اور غور و فکر کیجئے۔ کیا عجب کہ دین اسلام کی یہ بھولی ہوئی منزل بھی تبلیغ دین کے مسافروں کو یاد آ جائے اور دنیا میں پھر سے عدل و قسط پر مبنی نظام خلافت قائم ہو جائے۔ OO

رواں صدی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے فکری احیاء کی صدی ہے!

تمام مکاتب فکر جامد مذہبیت سے نکل رہے ہیں

اسلامی نظام حیات کا شعور ہی نہیں' اس کو قائم کرنے کا منہج بھی واضح ہونا چاہیے

احیائی تحریکوں کی ناکامی کا اصل سبب منہج انقلاب نبوی سے انحراف ہے

شاہد مجید

رواں صدی کے آغاز میں جبکہ صدیوں کے انحطاط کے باعث مسلمانوں کے دینی تصورات مسخ ہو چکے تھے' اسلامی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں شروع ہوئیں۔ مولانا محمود الحسن دیوبندی" ' علامہ اقبال" ' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم' مولانا الیاس" اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی" کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں اسلام کے حقیقی تصورات زندہ ہوئے۔ سید مودودی" کی زور دار تحریروں کے نتیجے میں امت مسلمہ کے پڑھے لکھے طبقے میں دو طرح کے نظریات خوب پھیلے۔ اولاً اسلام کے مکمل نظام حیات ہونے کا تصور اور ثانیاً فریضہ اقامت دین' اس کی اہمت اور تقاضے۔ جہاں تک اسلام کے نظام حیات ہونے کا تعلق ہے تو یہ نظریہ اب قبول عام حاصل کر چکا ہے اور پڑھے لکھے لوگوں میں سے بہت ہی کم لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں۔ البتہ اقامت دین کا فریضہ پڑھے لکھے لوگوں کی بھی ایک بڑی تعداد پر اب تک واضح نہیں ہو سکا۔ جبکہ عوام الناس تو محض نماز و روزہ کو ہی کل دین سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی فکری و عملی کوششوں کے نتیجے میں ایک معتدبہ تعداد میں اس فرض کا تصور راسخ ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج پاکستان میں جماعت اسلامی کے علاوہ اسی فکر کو لے کر چلنے والی اور جماعتیں بھی وجود میں آ چکی ہیں۔ تنظیم اسلامی پڑھے لکھے طبقے کے اندر اور تنظیم الاخوان اہل تصوف میں اس فکر کو عام کر رہی ہیں۔ جبکہ تحریک الدعوۃ والارشاد اہل حدیث مکتب فکر اور تحریک منہاج القرآن بریلوی مکتب فکر کے لوگوں میں ان نظریات کو عام کر رہی ہیں۔ کچھ اور لوگ بھی انفرادی حیثیت میں یہ کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تبلیغی جماعت کے ذریعے اجتماعیت کی اہمیت اور دعوت و تبلیغ کی اہمیت بھی امت کے ایک بڑے طبقے میں اجاگر ہوئی ہے۔ اجتماعیت اور دعوت کی اہمیت کو بریلوی مکتب فکر میں دعوت اسلامی اجاگر کر رہی ہے۔ گویا اسلام کے مسخ شدہ تصورات اب دوبارہ زندہ ہو رہے ہیں اور جوں جوں ان جماعتوں کے ذریعے دعوت کا کام آگے بڑھے گا مزید لوگوں میں یہ تصورات اجاگر ہوتے چلے جائیں گے اور گویا قرآن مجید کے مطابق "لترکبن طبقا عن طبق" یعنی "تم لازماً ترقی کرو گے درجہ بدرجہ"۔ اسلام کے احیاء

> **"ان جماعتوں کی دعوتی مساعی کے نتیجے میں ایک اور اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ مسلک پرستی اور فرقہ بندی کے اثرات کسی درجے میں کم ہو رہے ہیں"**

کا عمل تدریج آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

ان جماعتوں کی دعوتی مساعی کے نتیجے میں ایک اور اہم فائدہ یہ ہوا ہے کہ مسلک پرستی اور فرقہ بندی کے اثرات کسی درجے میں کم ہو رہے ہیں۔ جو لوگ ان جماعتوں کے زیر اثر آ رہے ہیں ان میں دعوت کے کام کی برکت سے تحمل مزاجی اور برداشت کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے اور یہ اختلافی بحثوں سے کسی قدر گریز کرتے ہیں۔ اس عمل کے جہاں مثبت پہلو ہیں وہاں ایک منفی پہلو بھی ہے کہ اگر ان جماعتوں کے قائدین اور اکابرین نے اپنے کارکنوں کی صحیح تربیت نہ کی' ان کو شخصیت پرستی اور جماعت پرستی کے خول سے نہ نکالا تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلکی تعصب کی جگہ جماعتی تعصب وجود میں آ جائے۔ بہرحال اس وقت تک مجموعی طور پر خیر غالب ہے۔ اس ضمن میں کرنے کا کام یہ ہے کہ ان تمام جماعتوں کے قائدین اپنے انداز فکر اور کوششوں کو اپنے اجتماعات میں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور اپنے آپ کو سب سے بالاتر اور بہتر ثابت کرنے سے گریز کریں' اور دوسروں کے کام کی نفی کرنے کی بجائے ان کے اخلاص اور کوششوں کو تسلیم کریں۔ تنقید برائے تنقید سے گریز کرتے ہوئے جہاں ضروری ہو پورے اخلاص اور خیر خواہی کے جذبہ سے دوسری جماعتوں سے اپنے اختلاف رائے اظہار کریں۔ مزید برآں وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجتماعات میں دوسری دعوت یہ اقامت دین کا کام کرنے والی جماعتوں کے قائدین کو مدعو کر کے ان کے موقف سے بھی آگاہی حاصل کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ کارکنوں میں قوت برداشت' دوسروں کے قائدین کے لئے احترام' اعلیٰ ظرفی اور شعور پیدا ہو گا اور ایک دوسرے کی بات سمجھنے کا موقع ملے گا جبکہ بدگمانیوں اور تلخیوں کا بھی خاتمہ ہو گا۔ نیز اسی کے نتیجے میں آگے چل کر اتحاد و یکجہتی اور مشترکہ جدوجہد کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔ کارکنوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے قائدین سے حسن ظن رکھنے اور ان کا بھرپور ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ جہاں ضروری ہو ان کا احتساب بھی کریں' اور دوسری دینی جماعتوں کے ساتھ تعاون پر انہیں آمادہ بھی کریں۔

قائدین کے باہمی رابطوں کے ضمن میں امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی کوششیں قابل

تعریف ہیں کہ انہوں نے مختلف جماعتوں کے قائدین کو اپنے اجتماعات میں خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا ہے اور یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس روایت کو تمام جماعتوں کو اپنانا چاہئے' اگرچہ تاحال اس کی مثال کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو فاصلے بڑھتے جائیں گے اور مستقبل میں اس بات کا خدشہ ہے کہ جماعتی چپقلش بڑھتے بڑھتے شدید صورت اختیار کر جائے گی۔

کچھ عرصہ سے ان جماعتوں نے اپنے سالانہ اجتماعات منعقد کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اسی کے نتیجے میں گزشتہ دو تین ماہ کے دوران لاہور میں بالخصوص دینی اجتماعات کی بہار آئی ہوئی تھی۔ لاہور کے علاوہ کچھ جماعتوں کے اجتماعات مرید کے' منارہ اور ملتان میں بھی منعقد ہوئے۔ ان سب اجتماعات میں بلامبالغہ لاکھوں فرزندان اسلام نے شرکت کی' جو اس لحاظ سے اطمینان بخش ہے کہ دین کی خدمت کا جذبہ ابھی پاکستان کے مسلمانوں میں موجود ہے۔ اصل مسئلہ اس جذبے کو صحیح رخ پر ڈالنے اور خیر کو جمع کرنے کا ہے۔ ایک اور خوش آئندہ پہلو یہ ہے کہ ان اجتماعات میں دوسری جماعتوں کے کارکنان اور بعض مواقع پر قائدین بھی شریک ہوئے۔ گویا یہ چیز اس بات کی غماز ہے کہ فاصلے نسبتاً کم ہو رہے ہیں۔

> **"دینی جماعتوں کے قائدین اور اکابرین نے اپنے کارکنوں کی صحیح تربیت نہ کی' ان کو شخصیت پرستی اور جماعت پرستی کے خول سے نہ نکالا تو اس بات کا امکان موجود ہے کہ مسلکی تعصب کی جگہ جماعتی تعصب وجود میں آ جائے"**

متذکرہ بالا مساعی کے جہاں بہت سے خوش کن پہلو ہیں وہاں دو اہم سوالات بھی سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ اتنی کوششوں کے باوجود اب تک اسلامی انقلاب کیوں نہیں برپا ہو سکا اور دوسرے یہ کہ دینی جماعتیں کس طرح اکٹھی ہو سکتی ہیں؟ ان دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے کہ اب تک اقامت دین کے لئے جتنی بھی کوششیں کی گئی ہیں وہ پوری طرح سے طریق نبویؐ کے مطابق نہ تھیں۔ اسی لئے یہ کوششیں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکیں۔ مزید برآں اگر منہج انقلاب نبویؐ کو سمجھ لیا جائے اور اسی کے مطابق جدوجہد کی جائے تو یہی وہ نکتہ ہے کہ جس پر مشترکہ جدوجہد ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اجتماعیت کی اہمیت' دعوت کی ضرورت' اسلام کے مکمل نظام حیات ہونے کا شعور اور اقامت دین کا تصور زندہ ہونے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نکتے پر غور و فکر اور باہم تبادلہ خیال شروع کیا جائے کہ اسلامی انقلاب کا طریقہ کار کیا تھا؟ اور اس ضمن میں نبی اکرمؐ کا منہج کیا تھا۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد ہے کہ "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح نہ ہو سکے گی مگر اسی طریقے پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی۔" اگر تمام جماعتیں اپنے اپنے انداز دعوت اور طریقہ تربیت پر قائم بھی رہیں لیکن انقلاب کی حکمت عملی' بالخصوص آخری مرحلے پر متفق ہو جائیں تو پیش رفت ہو سکتی ہے۔

اسلامی انقلاب کے لائحہ عمل کے ضمن میں اب تک پانچ طریقے سامنے آئے ہیں۔ پہلا معروف طریقہ "انتخابات" کا ہے۔ یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ انتخابات سے صرف چہرے بدلا کرتے ہیں' نظام نہیں۔ مروجہ الیکشن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا کھیل ہے' جس میں جس کے پاس جتنا کالا دھن ہے اور جو جتنا بڑا دھوکے باز' فریبی اور جھوٹا ہے' اتنا ہی کامیاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اسلام پسند لوگ نہیں کر سکتے۔ مزید برآں انتخابی عمل کے اپنے ہنگامے' ترجیحات اور مصروفیات ہیں' ان کی موجودگی میں دعوت اور تربیت کا کام محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی تک لوگوں میں یہ شعور پیدا نہیں ہو سکا کہ وہ اچھے اور برے آدمی میں سے اچھے کو منتخب کریں۔ جاگیرداری سرمایہ داری' فرقہ بندی' برادری ازم' صوبائی قوم پرستی اور ناخواندگی کی موجودگی میں انتخابات میں دینی عناصر کی کامیابی کے امکانات معدوم کے درجہ میں ہیں۔ حضورؐ کی انقلابی جدوجہد کے آخری مرحلے میں تصادم ہوا اور صحابہؓ نے جانوں کے نذرانے پیش کئے جبکہ انتخابی کشمکش میں نہ تصادم ہوتا ہے اور نہ جانیں جاتی ہیں لہٰذا یہ غیر انقلابی راستہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے لوگوں کی ایک عظیم اکثریت کی اصلاح کر دی جائے' اس سے خود بخود انقلاب آ جائے گا۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضور اکرمؐ سے بڑھ کر کوئی داعی اور مبلغ اب دنیا میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب آپؐ نے خود دعوت و تبلیغ کے بعد تلوار اٹھائی اور اس کے ذریعے باطل کو کچل کر انقلاب برپا کیا تو اب محض دعوت و تبلیغ کے ذریعے انقلاب کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دعوت و تبلیغ سے صرف افراد بدلا کرتے ہیں نظام نہیں۔ پھر پوری انسانی تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے جہاں محض دعوت و تبلیغ سے انقلاب برپا ہو گیا ہو۔

تیسرا طریقہ فوجی بغاوت کا ہے کہ فوج کا ایک طبقہ بغاوت کر کے باطل حکومت کا تختہ الٹ دے اور اسلام کے نفاذ کی کوشش کرے۔ یہ ایک عارضی' ناپائیدار اور سازشی طریقہ کار ہے۔ اس میں عوام کی مرضی شامل نہیں ہوتی لہٰذا اس کے اثرات بھی جڑوں تک نہیں پہنچ پاتے۔ مزید برآں مذہبی طبقے کا تختہ کوئی سیکولر طبقہ بھی الٹ سکتا ہے۔ گویا جس طریقے سے وہ انقلاب آتا ہے' دوسرا طبقہ وہی طریقہ اختیار کر کے اس انقلاب کو ختم بھی کر سکتا ہے یعنی Counter revolution بھی برپا ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں طریقے سنتؐ سے ثابت نہیں ہیں۔ جبکہ چوتھا طریقہ مسلح تصادم ہے' جو ایک منظم جماعت کی جانب سے ہو۔ آنحضورؐ نے دعوت' تنظیم' تربیت' صبر' ہجرت اور اقدام کے بعد ہی یہی طریقہ اختیار کیا اور باطل کو کچل کر رکھ دیا۔ اس ضمن میں یہ بات سامنے رکھنا ہو گی کہ حضورؐ نبی اور رسول تھے اور آپؐ نے دعوت کا حق ادا کر کے کفار پر اتمام حجت کر دیا تھا۔ جبکہ آج کوئی بھی اتمام حجت کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور مقابلے پر کافر نہیں بلکہ مسلمان ہیں جو اگرچہ فاسق ہیں مگر کلمہ گو ہیں۔ مزید یہ کہ اس وقت باقاعدہ منظم فوج نہ تھی جبکہ آج تو منظم فوج اور اس میں فضائیہ اور انٹیلی جنس کے ادارے بھی موجود ہیں۔ قرآن حکیم نے مومنین کو دس گنا بھاری دشمن پر فوقیت دی ہے جبکہ آج فرق کہیں زیادہ ہے۔ پھر یہ کہ آپؐ نے جہاں برائی کو طاقت سے کچلنے کا حکم دیا ہے وہاں مسلمان حکمران کے خلاف خروج سے منع بھی کیا ہے اور کڑی شرائط لگا کر خروج کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ اب آخری مرحلہ سر کرنے کے لئے اجتہاد ہو سکتا ہے۔ انقلاب کے ضمن میں اصول یہی ہے کہ تصادم ہو اور جانوں کی قربانی دی جائے۔ اس

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

سرد جنگ کے بعد امریکہ کا کردار ختم ہو کر رہ گیا ہے؟

کیا امریکہ محض عسکری قوت کے بل بوتے پر عالمی سیاست میں چھایا رہے گا؟

خلیج کی جنگ کی پشت پر کوئی عالمی اہمیت کا مسئلہ موجود نہیں تھا!!

تحریر : Norman A Graebner اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

سرد جنگ کے دوران روس کے مقابلے میں ایک طرف امریکہ کو جہاں شاندار برتری حاصل رہی وہیں بطور عالمی طاقت اس کے زوال کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کی معاشی خوشحالی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ماند پڑنے لگی تھی۔ جرمنی اور جاپان مدمقابل بن کر سامنے آ رہے تھے۔ دنیا کے ۲۰ سب سے بڑے بینکوں میں سے ۱۱ جاپان کی ملکیت تھے' جس سے بین الاقوامی مالیاتی مرکز نیویارک کی بجائے جاپان منتقل ہو گیا۔ یہاں تک کہ صنعتی اختراعات اور اہلیت کار میں بھی جاپان آگے تھا۔ ۱۹۹۰ء میں امریکہ سے نصف آبادی کے ملک جاپان میں صنعتی تحقیق' تنصیبات اور ساز و سامان پر امریکہ کے مقابلے میں زیادہ رقم خرچ کی گئی۔ لیکن جب تک امریکہ اور یورپ کے سامنے روسی خطرہ موجود تھا' شاہ خرچیوں کا مظاہرہ کر کے امریکہ دنیا پر چھایا رہا لیکن ۹۰-۱۹۸۹ء میں جوں ہی روس نظروں سے اوجھل ہوا' امریکہ کا عالمی کردار بھی بے وقعت ہو گیا اور اس کی حیثیت دنیا کی باقی قوموں میں ایک قوم کی رہ گئی۔ تاہم صدر جارج بش کی خلیج کی جنگ نے امریکہ کو عالمی معاملات میں عسکری قوت کے بل پر اپنا دبدبہ قائم رکھنے کا ایک عارضی موقع فراہم کر دیا۔ خلیج میں برطانوی فوجوں کے کمانڈر' جنرل پیٹر ڈی لا بلیری (Gen. Peter de la Billieri) نے اسے "بہت بڑی فتح۔ ایک عظیم تاریخی فتح" قرار دیا۔ صدر بش نے یکم مارچ ۱۹۹۱ء کو خوشی سے پھولا نہ سماتے ہوئے کہا' "خدا کی قسم ہم نے ویت نام کا داغ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دھو دیا ہے"۔ جان ہیوز (John Hughues) نے "کرسچین سائنس مانیٹر" میں لکھتے ہوئے کہا کہ "اب کسی قوم میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ امریکی عظمت کے سامنے سرنگوں نہ ہو' چین کا بہ مشکل نام سننے میں آتا ہے' اقتصادی دیو' جاپان اور جرمنی فوجی طاقت نہ ہونے کے سبب خلیج کی جنگ میں کوئی جوہر دکھانے سے محروم رہے ہیں"۔

صحرائی طوفان' (ڈیزرٹ سٹارم) کا آغاز ہوا تو ۱۶ جنوری کو صدر نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا "ہمیں موقع ملا ہے کہ اپنے اور اپنی آئندہ نسلوں کی خاطر ایک نیا عالمی نظام وضع کریں تاکہ دنیا میں قانون کی حکمرانی ہو؟"۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو جنگ کی سرے سے کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ یہ تو ایک بہانہ تھی جو صدر صدام کی حماقتوں کی وجہ سے امریکہ کے ہاتھ آ گیا تھا۔ جیسا کہ نیویارک ٹائمز میں تھامس ایل فریڈمین کا کہنا تھا "کاٹھ کے اس پتلے' صدام حسین نے جس کے چہرے سے ہی بدبختی عیاں تھی' ایسی لاجواب اداکاری کی کہ سچ مچ دنیا بھر کی نفرتوں کا ہدف بن گیا"۔

> "خلیج کی جنگ ایک بہانہ تھی جو صدر صدام کی حماقتوں کی وجہ سے امریکہ کے ہاتھ آ گیا تھا' صدام حسین جس کے چہرے سے ہی بدبختی عیاں تھی' نے ایسی لاجواب اداکاری کی کہ سچ مچ دنیا بھر کی نفرتوں کا ہدف بن گیا"

لارنس فریڈمین نے "فارن افیرز" میں تحریر کرتے ہوئے بڑبڑائی کہ خلیج کی جنگ میں فتح حاصل کر کے ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ بین الاقوامی تاریخ کے اس نئے دور کے تقاضے اور ان میں مغرب کا کردار اپنی مرضی سے معین کریں۔ کالم نگار چارلس کراؤتھمر (Charles Krauthammer) کے مطابق یہ ضروری ہو گیا ہے کہ امریکہ اب آگے بڑھ کر دنیا کے ممالک کو خبردار کرے کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر رہیں اور ضروری ہو تو انہیں تباہ کن ہتھیاروں سے محروم کر دے۔ آخر میں اس نے تجویز کیا کہ حالات پہلے کی نسبت زیادہ غیر معمولی ہیں۔ ماضی کی طرح سلامتی کا انحصار امریکی طاقت اور اس کے اس عزم پر ہے کہ اسے پوری دنیا کی قیادت سنبھالنا ہے لہٰذا ہمیں دنیا کو قانون دینے اور اس پر عمل کرانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہئے۔

یہ تصور کہ امریکہ کے پاس جنگی طاقت موجود ہے' اس لئے اس کی ذمہ داری ہے کہ جہاں بھی امن کو خطرہ درپیش ہو وہ اٹھ کر اس خطرے کو مٹا دے' تھا تو بہت خوشنما مگر اسے پیش کرنے والے تاریخ سے ملنے والا یہ سبق نظرانداز کر گئے کہ طاقت کا بار بار استعمال اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب اس سے اپنے مسلمہ قومی مفادات کا دفاع مطلوب ہو۔ خلیج کی جنگ سے امریکی اسلحہ کی دھاک تو بیٹھ گئی مگر ایک عام ملک کو اس سے کیا غرض ہے۔ ایک ایسا ملک جسے نہ امریکی طاقت کا ڈر ہے اور نہ اپنے لئے اس کی کوئی ضرورت ہے وہ امریکہ کی چودھراہٹ کیوں قبول کرے۔ بین الاقوامی برادری شور شرابے کی بجائے امن اور استحکام کو ترجیح تو دے سکتی ہے مگر کسی خود

ساختہ عالمی پولیس مین کی کوئی کیوں پرواہ کرے؟۔ خلیج میں ایسا کوئی دشمن نہیں تھا جو امریکہ کو فتح کرنا چاہ رہا تھا اور اس وجہ سے امریکہ کے لئے وہاں اپنی فوجیں اتارنا ضروری ہو گیا تھا۔ کویت سے اگر کسی ملک کا مفاد وابستہ تھا تو وہ برطانیہ تھا' نہ کہ امریکہ۔ مقامی اور علاقائی جھگڑے تو ہوتے رہیں گے مگر ہٹلر یا روس کے خطرے سے ان کا کوئی تقابل نہیں۔ روس کے خاتمے سے امریکی اثر و رسوخ میں اضافے کی بجائے الٹا کمی واقع ہوئی ہے۔ بعض مصنفین نے' جن میں یونیورسٹی آف شکاگو کے جان میئرشمر (John Mearsheimer) شامل ہیں' خدشہ ظاہر کیا تھا کہ سرد جنگ کے خاتمے سے یورپی طاقتوں کی آپس کی پرانی دشمنی جاگ جائے گی۔ جو امریکہ کے لئے پریشانی کا باعث ہو گی' جو امریکی یہ توقع کر رہے تھے کہ فوجی طاقت ہونے اور اس طاقت کو استعمال کرنے پر ہر وقت تیار رہنے کی وجہ سے امریکہ کی اجارہ داری ہمیشہ قائم رہے گی' جلد ہی انہیں معلوم ہوا کہ قومیتوں کے ملوفان' نسلی تنازعات' سرحدی جھگڑوں' معاشی اور سماجی افراتفری اور خانہ جنگیوں کی شکل میں انہیں نئے عالمی چیلنج کا سامنا ہے۔

سی ۔ آئی ۔ اے کے ڈائریکٹر جیمز ولسے (John Woolsey) نے اس صورتحال کو یوں بیان کیا "ہم نے بہت بڑا اژدہا تو مار لیا مگر اب ایک ایسے جنگل میں آ گئے ہیں جو طرح طرح کے زہریلے سانپوں سے بھرا ہوا ہے"۔ چنانچہ صدر بش نے ان مسائل کو دیکھتے ہوئے نیو ورلڈ آرڈر کی بات آگے بڑھانے کے پروگرام سے دستبردار ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ امریکی فارن سروس کے ایک افسر رالف پیٹرز کا جو روس کے خاتمے کے عمل کو قریب سے دیکھتے رہے تھے' کہنا تھا "ہمیں اپنے لوگوں کی فکر کرنی چاہئے' دوسرے اگر لڑ مر رہے ہیں تو یہ ہمارا درد سر نہیں"۔

پینٹاگان کے مطابق امریکہ کو اپنی سپر پاور کی حیثیت برقرار رکھنے اور تیل کی سپلائی وغیرہ یقینی بنانے کے لئے ابھی دو اہم جنگیں لڑنا ہیں' جو عراق' ایران' شام' لیبیا' شمالی کوریا' چین' کیوبا اور سابقہ روسی جمہوریاؤں کے خلاف ہو سکتی ہیں لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ان ممالک سے امریکی مفادات کو کیا حقیقی خطرات لاحق ہیں۔ نیز کیا ان ممالک کے کوئی مفادات نہیں ہیں جنہیں تحفظ فراہم کرنا ان کی ذمہ داری ہو اور جنگ کی صورت میں امریکہ کی نسبت ان کے پامال ہونے کا زیادہ اندیشہ ہو۔ یورپ کسی بھی بیرونی خطرے کے خلاف اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ اس کے بعد کون سے وہ خطرات ہیں کہ پینٹاگان کے اخراجات کا تخمینہ ۲۵۰ بلین ڈالر سے نیچے نہیں آتا۔ بہت سے ماہرین قومی وقار اور اور عالمی معاملات میں اپنا اثر قائم رکھنے کے لئے زیادہ دفاعی اخراجات اور طاقت استعمال کرنے کے عزم کی وکالت کرتے ہیں لیکن سرد جنگ کے تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگی تیاریوں سے قومی وقار میں اضافہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب کسی ملک کے مسلمہ قومی مفادات کو واضح خطرہ لاحق ہو اور رائے عامہ اس خطرے کا طاقت سے مقابلہ کرنے کے حق میں ہو' ورنہ بلاوجہ طاقت کا مظاہرہ کرنے سے قومی وقار اور اثر و رسوخ میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ خلیج کی جنگ میں شاندار کامیابی کے بعد خیال تھا کہ امریکی عوام اب آئندہ اس طرح کی فوجی مہموں کا پرجوش خیرمقدم کریں مگر ایسا نہیں ہوا۔ جولائی ۱۹۹۳ء میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے ایک جائزے کے مطابق امریکی عوام کی اکثریت بین الاقوامی جھگڑوں میں بلاجواز امریکی مداخلت کے خلاف تھی۔

۱۹۹۰ء کے بعد سے امریکہ بیک وقت دنیا کا امیر ترین ملک بھی رہا ہے اور سب سے بڑا مقروض ملک بھی۔ جارج اور واشنگٹن سے لے کر ڈوائٹ آئزن ہاور کے ۱۶۰ سالہ دور میں حکومت کبھی مقروض نہیں رہی۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں صدر لنڈن جانسن کے ویت نام کی جنگ کے اخراجات اور ملکی ضروریات پوری کرنے کے لئے قرض لینے سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں' جو صدر ریگن کے انتخاب کا سال ہے ملک ۹۰۹ بلین ڈالر کا مقروض تھا' جو ۱۹۸۲ء میں بڑھ کر ٹریلین' ۱۹۸۶ء میں ۲ ٹریلین' ۱۹۹۰ء میں ۳ ٹریلین' ۱۹۹۲ء میں ۴ ٹریلین اور جنوری ۱۹۹۴ء میں ۴ اعشاریہ ۸ ٹریلین ڈالر تک پہنچ گیا۔ ۲۰۰۰ء تک اندازہ ہے کہ یہ رقم ۶ ٹریلین ڈالر ہو جائے گی۔ جرمنی کے ایک مشہور نیوز میگزین Der spiegel نے ۱۹۹۲ء میں بجا طور پر لکھا تھا کہ کوئی امریکہ والوں کو بتائے کہ ان کا نظام کتنے بڑے بحران سے دوچار ہے۔ جنگی طاقت اپنی جگہ لیکن جو ملک اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا اسے پوری دنیا کا بنانا بننا زیب نہیں دیتا۔ چنانچہ Harper's Magazine میں کم ہومز (Kim holmes) نے لکھتے ہوئے کہا کہ اپنے آپ کو بھول کر باہر خیراتیں بانٹتے پھرنا اس عہد کی خلاف ورزی ہے جو حکومت اور امریکی عوام کے مابین ہے۔

سرد جنگ کے بعد کے امریکی کردار میں جو تضادات سامنے آئے ہیں ان کا سبب وہ بنیادی' مگر ایک دوسرے کے مخالف راہیں اختیار کرنا ہے۔ میکائیل کنزلے (Michael kinsley) نے The News Republic میں اسے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ کہنا کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد امریکہ کا کوئی عالمی کردار باقی نہیں رہا' بحث طلب ہو سکتا ہے' اس کے برعکس یہ موقف بھی اتنا ہی محل نظر ہے کہ فی الواقع ہم ایک عظیم' جرات مندانہ اور درد مند قوم ہیں اور دنیا کو راہنمائی فراہم کرنا ہمارا حق ہے۔ جو بات ان دونوں کے مقابلے میں بالکل ہی بے معنی اور نقصان دہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ دونوں انتہائیں ایک جیسی جائز ہیں۔ بالفعل ہماری انتظامیہ کے طرز عمل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مئی ۱۹۹۴ء کے آخر میں صدر نے صحافیوں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ ہر جگہ ہماری مرضی نہیں چل سکتی لہٰذا ہمیں لچکدار رویہ اختیار کرنا ہو گا اور دوسروں کی بات پر بھی توجہ دینی پڑے گی۔ ایک حد تک ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ تاہم ان کا کہنا تھا کہ امن و امان' بھوک و افلاس کا خاتمہ' جمہوریت کا فروغ اور انسانی حقوق کے تحفظ کے بارے میں ہماری تشویش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ لیکن یہی اہداف جن کا ہمیشہ بڑے زور و شور سے ڈھنڈورا پیٹا گیا' عملاً کلنٹن انتظامیہ کی نظروں سے بھی اوجھل رہے ہیں۔ جیسا کہ ہمارا معمول رہا ہے ہم نے ناپسندیدہ حکومتوں کو ہٹانے پر ساری توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ان کے ساتھ کہیں بھی کامیاب مذاکرات نہیں کر سکے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

"امریکہ کے طاقت استعمال کرنے کا تصور پیش کرنے والے تاریخ سے ملنے والا یہ سبق نظر انداز کر گئے کہ طاقت کا بار بار استعمال اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب اس سے اپنے مسلمہ قومی مفادات کا دفاع مطلوب ہو"

جناب صدر مملکت !

آپ کا یہ اعلان کہ "میں بنیاد پرست ہوں" قابل ستائش ہے مگر . . .

ٹی وی پروگراموں پر نظر ڈالیں تو یوں لگتا ہے کہ پاکستان گویوں' بھانڈوں اور مسخروں کا ملک ہے !!

ہر شخص کو اس کے عہدے اور صلاحیت کے مطابق اپنے رب کو جواب دینا ہو گا

نجیب صدیقی

صدر پاکستان جناب محترم فاروق احمد خاں لغاری نے اپنی ایک تقریر میں دو ٹوک اور واضح انداز میں کہا ہے کہ وہ خود بنیاد پرست ہیں اور اسلام قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان بنیاد پرست ہوتا ہے۔ اس بات نے اس کنفیوژن کو دور کر دیا ہے۔ صدر مملکت کا یہ ارشاد ایک سربراہ کا ارشاد ہے جسے ہم حکومتی پالیسی بھی کہہ سکتے ہیں لہٰذا وہ لوگ جو بنیاد پرستی سے بار بار اعلان براءت کر رہے ہیں انہیں سنبھل جانا چاہئے۔

اس ارشاد کے بالمقابل حکومتی ادارے بنیاد پرستی کے خلاف ایک مضبوط محاذ بنانے میں لگے ہوئے ہیں محترمہ وزیر اعظم صاحبہ تو گویا اس مشن کی سربراہ ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں سے اس بنیاد پرستی پر گولہ باری نہ کی جا رہی ہو۔ ذرائع ابلاغ چونکہ حکومت کے کنٹرول میں ہیں اس لئے اس کا بھرپور استعمال اس مقصد کے لئے کیا جا رہا ہے۔

موقع پرست لوگ سرکار کا رخ دیکھ کر وہ باتیں کہہ رہے ہیں جو ان کے قد سے ہزار گنا بلند ہیں۔ ایک انتہائی ذمہ دار شخص کہتا ہے کہ میرا بس چلے تو یہ تمام ادارے بند کر دوں' اس لئے کہ یہاں سے بنیاد پرست پیدا ہوتے ہیں۔ اس شخص کو معلوم ہونا چاہئے کہ تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے "اجالوں" کو قید کرنے کی کوشش کی مگر ان کی قسمت میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا۔ تمام مساجد بنیاد پرستی کے اڈے ہیں' ایک مسلمان دن میں پانچ بار مسجد میں حاضر ہو کر اپنی بنیاد پرستی کا اعلان کرتا ہے۔ مسجد کے میناروں سے بلند آواز سے بنیاد پرستی کی صدا لگائی جاتی ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں بنیاد پرستی کا صور پھونکا جاتا ہے۔ سال میں ایک بار ہر مسلمان اپنے ہاتھ سے سنت ابراہیمی کی پیروی میں جانور ذبح کرتا ہے اور اپنی بنیاد پرستی کا اعلان کرتا ہے۔ چھری سے ٹپکنے والا خون کا ہر قطرہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ دین کے لئے کبھی وقت آیا تو وہ اپنا خون بھی اسی طرح اللہ کے راستے میں نچوڑ دے گا۔

اس بنیاد پرستی کے سب سے بڑے علمبردار نبی اکرم ﷺ ہیں۔ اس کے بعد آپ کے صحابہ ہیں' وہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور قیامت تک چلتا رہے گا۔ وہ شخص انتہائی بدبخت ہو گا جو اس کا راستہ روکنے کے لئے آگے بڑھے گا۔ بنیاد پرستی ہر مسلمان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ کلمہ ایک مسلمان کی بنیاد ہے۔

> "تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے "اجالوں" کو قید کرنے کی کوشش کی مگر ان کی قسمت میں ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ نہ تھا"

اس بنیاد کو ڈھا دو تو پھر وہ مسلمان کہاں رہے گا۔ اس شخص کی جگہ منافقوں میں ہو گی یا مرتدوں میں۔ وہ لوگ جو بنیاد پرستی سے اپنی علیحدگی کا اعلان کرتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ کوئی دوسرا دین اپنی پسند کا اختیار کر لیں۔ امریکہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسلام کی بنیاد پر تیشہ چلانے والے سوچ لیں کہ وہ اللہ سے اعلان جنگ کر رہے ہیں' قرآن اللہ کی کتاب ہے' وہی بنیاد ہے' اس کی دعوت بنیاد پرستی کی دعوت ہے۔ تم واشنگٹن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے رب سے جنگ کرنا چاہتے ہو تو سوچ کر فیصلہ کرو! بہت اچھا ہوا کہ صدر مملکت نے یہ دو ٹوک اعلان کر دیا' مگر صرف اعلان کافی نہیں ہے۔ صدر مملکت سیکریٹریٹ سے آرڈی نینسوں کا جس تیزی سے اجراء ہو رہا ہے کیا ایسا کوئی آرڈی نینس جاری نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے' اس کی بنیاد اسلام ہے اور اس بنیاد پرستی کے خلاف ہر آواز قابل تعزیر ہو گی۔ اگر ایسا آرڈی نینس جاری نہیں ہوتا تو محض وعظ کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے تو آرڈی نینس چلے آ رہے ہیں' ایک انتہائی اہم اور بنیادی بات کے لئے نہیں آ سکتے۔ صدر مملکت کو اپنی صفوں پر نگاہ ڈالنی چاہئے' ان میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو بنیاد پرستی کے خلاف اپنا زور صرف کر رہے ہیں۔ ان سے اپنی صفوں کو پاک کریں۔ آپ کی پارٹی میں جو لوگ بنیاد پرستی کے خلاف لب کشائی کرتے ہیں ان کی خبر لیں۔ صدر مملکت کے گھر پر T.V ضرور ہو گا' ذرا اس کے پروگراموں پر نظر ڈالیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان گویوں' بھانڈوں' اور مسخروں کا ملک ہے۔ بے حیائی اور بے غیرتی برہنہ ہو چکی ہے۔ اس کا ہر پروگرام بے حیائی کے فروغ کے لئے ہے اور بنیاد پرستی پر تیشہ بن کر گرتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور آپ

اس کے سربراہ ہیں اور آپ خود بنیاد پرست بھی ہیں' یہ ہماری خوش نصیبی ہے' لیکن پاکستان سے "ثقافت" کے نام پر جسے ہم سراسر "ثقافت" کہہ سکتے ہیں ناچنے اور گانے والوں کی ٹولیاں غیر ملکوں میں جاتی ہیں کیا وہ ہمیں نظریاتی ملک کی نمائندگی کرتی ہیں؟

امن و امان کا مسئلہ بھی آپ کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ایک عرصہ سے کراچی والے بے امن ہیں۔ اس کی واحد وجہ دوہرا معیار ہے۔ ہمارے ملک میں اگر عدل و انصاف قائم ہو جائے تو تمام جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ ایک مومن جو بنیاد پرست ہوتا ہے اس کا اولین فرض یہی ہے کہ جب اسے اختیار حاصل ہو تو وہ عدل و انصاف قائم کرے۔ قرآن نے جتنی تاکید اس بارے میں کی ہے آپ اس سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ حضور ﷺ نے اس کی مثال قائم کی ہے جو رہتی دنیا تک روشنی کا مینار بن رہنمائی کرتی

"ایک عرصہ سے کراچی والے بے امن ہیں اس کی واحد وجہ دوہرا معیار ہے"

رہے گی۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے' ہر شخص موت کے قریب ہوتا جا رہا ہے' مہلت عمر جو بھی میسر ہے اس میں اگر اس نے اپنی آخرت درست نہ کی تو دوبارہ اسے مہلت نہیں ملے گی۔ ہر شخص کو اس کے عہدے اور صلاحیت کے مطابق اپنے رب کو جواب دینا ہوگا۔ عدل و انصاف تو غیر مسلموں کے نزدیک بھی عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ مسلمان کے یہاں تو یہ عین عبادت ہے' بلکہ اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اس کی سخت پرسش ہوگی۔ ہمارے ملک میں اگر عدل و انصاف قائم ہو جائے تو ہر خطہ پر امن ہو جائے گا۔ دوہرا معیار ہر صورت میں ختم ہونا چاہئے۔ OO

COMING SOON

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

Editor-in-Chief: Dr. Israr Ahmad

The Qur'anic Horizons

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore, is pleased to announce its forthcoming venture -- a regular periodical in English language.

The journal would include papers and articles written with the following aims and objectives:

- to effectively criticize and refute the un-Islamic features in the dominant Western paradigm;
- to reconstruct Islamic religious thought by presenting various Qur'anic themes in contemporary idiom;
- to find Islamic solutions to the problems afflicting the humanity in general and the Muslim Ummah in particular;
- to develop Qur'anic scholarship in sociology, law, philosophy, psychology, economics, and political science; and
- to develop detailed and practicable blueprints for the future Islamic state.

To receive a free introductory issue, please write to:

The Qur'anic Horizons

36-K, Model Town, Lahore-54700

امن مذاکرات!

اگر آپ ایک قتل کریں گے تو جیل جائیں گے۔ جب ایک سو آدمیوں کو قتل کر لیتے ہیں تو آپ ہیرو بن جاتے ہیں اور جب آپ لاتعداد انسانوں کے قتل کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں تو آپ کو امن مذاکرات کے لئے واشنگٹن آنے کی دعوت دے دی جاتی ہے۔

(بوسنیا کے صدر' عزت بیگووچ)

"اسلحہ یا رائے عامہ" کے علاوہ انقلاب کا ایک تیسرا راستہ بھی ہے!

انقلاب ایران سے خرم مراد صاحب کا صرفِ نظر ناقابلِ فہم ہے

الجزائر اور ترکی کی مثال دینے والے' ان ممالک سے عبرت بھی حاصل کریں

"ترجمان القرآن" میں شائع شدہ جناب خرم مراد صاحب کی نگارشات کے جواب میں نثار احمد ملک کی معروضات

"ندائے خلافت" کے بعض قارئین کی طرف سے گاہے بگاہے یہ شکایت آتی رہتی ہے کہ اس میں "جماعت اسلامی پاکستان" پر تنقید و تنقیص بہت زیادہ ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ ہمارے قارئین کی یہ شکایت کس حد تک درست ہے' یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ اگر "ندائے خلافت" کے صفحات میں اختلاف آراء کا اظہار ہوتا بھی ہے تو اکثر و بیشتر مثبت انداز میں اور جذبہ خیر خواہی کے تحت۔

اس وقت بھی چند گزارشات جماعت اسلامی کے حوالے سے ہی گوش گزار کرنی ہیں۔ یہ گزارشات "جماعت اسلامی" کے ترجمان' ماہنامہ "ترجمان القرآن" بابت ماہ جنوری کے اداریہ کے حوالے سے ہیں۔ "ترجمان القرآن" کے مدیر محترم خرم مراد صاحب نے جن کے علم و فضل کے ہم معترف ہیں' ماہ جنوری کے شمارے میں جو اداریہ رقم فرمایا ہے' اس کا عنوان "طریق انقلاب : اسلحہ یا رائے عامہ؟" ہے۔ بعض اعتبارات سے یہ اداریہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اس لئے کہ اس کا موضوع بہت ہی حساس ہے۔ اس موضوع کا بہت گہرا تعلق اسلامی انقلاب کی داعی تحریکوں کے مستقبل سے ہے۔ محترم خرم صاحب نے قارئین ترجمان القرآن کے دو چنیدہ خطوط کے جواب میں یہ تحریر رقم کی ہے۔ ترجمان القرآن کے مذکورہ قارئین کی پریشانی بھی یہی ہے کہ آخر کب تک فحاشی و عریانی' سیکولرزم اور جنسی جرائم کو برداشت کیا جائے' کیوں نا ایسا ہو کہ آگے بڑھ کر ان فحاشی و عریانی کے شکار افراد اور اداروں کو بموں سے اڑا دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ خطوط میں اس باطل نظام کے محافظین کے خلاف بھی شدید جذبات کا اظہار موجود ہے۔

محترم خرم مراد صاحب نے مذکورہ خطوط کے جواب میں اقامت دین اور غلبہ دین سے مراد کیا ہے نیز اس کے لئے جو مختلف طریقے' مسلح تصادم سمیت' تجویز کئے گئے ہیں' ان پر اظہار خیال کیا ہے اور جماعت اسلامی جو دستوری و جمہوری طریق کار پر گامزن ہے' اس طریق کار کے اختیار کرنے کے اسباب نیز نتائج و عواقب پر روشنی ڈالی ہے۔ مسلح تصادم کی نفی میں محترم خرم صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ کافی حد تک درست ہے لیکن ہم یہاں یہ عرض کریں گے کہ ان کی اس تحریر میں ایک بہت بڑا خلا موجود ہے' جس کا ذکر آگے آئے گا۔ وہ مختلف طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "چند اور محترم' صاحب علم و دانشور دوست ہیں' جو ہمارے شریک قافلہ تو نہیں مگر غلبہ دین کی منزل کے ہماری طرح جویا ہیں۔ وہ اپنے موقف کے حق میں شرعی و عقلی دلائل بھی لاتے ہیں' اور ملک کے سماجی' سیاسی اور معاشی حالات اور اب تک کے انتخابات کے تجربے سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جمہوریت کفر ہے' تبدیلی صرف مسلح جہاد سے آئے گی۔ بعض کے نزدیک اسلامی انقلاب' اپنی نوعیت کے اعتبار سے' انتخاب اور ووٹ سے آ ہی نہیں سکتا۔ بعض کہتے ہیں کہ پورا موجودہ نظام ہی باطل اور فاسد ہے' پہلے اس کو بدل دو۔ بعض کا خیال ہے کہ ہمارا نظام جس طرح کا ہے' اور موجودہ انتخابات جس انداز میں ہوتے ہیں' ان میں کامیابی ناممکن ہے مگر کیونکہ ہمارا آئین بالغ رائے دہی کے ذریعے حکمرانوں کے عزل و نصب کی بنیاد پر قائم ہے' اور حکومت کی پرامن تبدیلی کا کوئی راستہ انتخاب کے علاوہ نہیں' اس لئے ان تمام سنجیدہ بحثوں کا حاصل بھی ہمیں درج بالا پریشان خیالی و مایوسی سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتا"۔

"الجزائر اور مصر و شام میں مسلح تصادم سے انقلابی تحریکوں کو کچلا جا رہا ہے جبکہ ایران میں پرامن احتجاجی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گئی' اس کی کیا وجہ ہے؟"

آگے چل کر مسلح تصادم کی نفی کرتے ہوئے انہوں نے کہا ہے کہ "گن پوائنٹ پر ایک دل بھی سیدھا نہیں ہو سکتا' کجا یہ کہ سیاست' ثقافت اور صحافت اور قوم سب کو سیدھا کر دیا جائے"۔ ہم محترم خرم صاحب کی اس بات سے سو فی صد اتفاق کرتے ہیں۔ ان کی اس تحریر میں جس خلا کا ذکر ہم نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے دوسرے لوگوں اور تحریکوں کی طرح انہیں بھی اسلامی انقلاب کے صرف دو طریقے ہی دکھائی دیئے ہیں' کوئی تیسرا طریق کار نظر نہیں آیا۔ اس وقت پورے عالم اسلام میں اقامت دین کے لئے کام کرنے والی تحریکوں کا المیہ ہی یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے گروہ انتخابات کی بھول بھلیوں میں مبتلا ہیں جبکہ بعض دوسرے گروہ جو انتخابات سے یکسر

مایوس ہو چکے ہیں' وہ دوسری انتہا کو پہنچ کر چھاپہ مار کارروائیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ اگر محترم خرم مراد صاحب کے اس مضمون کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمیں انہی دو طریقوں کا تجزیہ نظر آتا ہے۔

وہ تیسری راہ جسے "سواء السبیل" کہا جا سکتا ہے' اس کا ذکر محترم خرم صاحب جیسے دانشور نے کیوں نہیں کیا' ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بہرحال ان جیسے صاحب علم اور باخبر آدمی سے اس بات کی توقع نہیں ہے کہ انہیں یہ تیسرا طریق کار معلوم نہ ہو۔ تیسرا طریق کار وہ ہے جسے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے اپنی کتاب "منہج انقلاب نبوی ؐ" کے آخری باب میں بیان کیا ہے۔ امیر تنظیم اسلامی نے سیرۃ النبی کا معروضی مطالعہ کر کے' اسلامی انقلاب کے مراحل بیان کئے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کے لئے سیرۃ النبی سے ہی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ عہد حاضر میں اسلامی انقلاب کے لئے نبی اکرم کے بنیادی منہج کو تو جوں کا توں ہو گا لیکن آخری مرحلہ سر کرنے کے لئے عہد حاضر کے سماجی' سیاسی و عمرانی ارتقاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب کے آخری باب میں ان تمام اسباب کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے اجتہاد ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جہاں انتخابات کے ذریعے اسلامی انقلاب کے خواب کو محض وقت کا ضیاع قرار دیا ہے' وہیں مسلح تصادم کے ذریعے انقلاب کو بھی بحالات موجودہ ناممکن العمل قرار دیا ہے۔ انہوں نے مسلح بغاوت کی شرعی حیثیت پر بھی گفتگو کی ہے اور اس کے جائز ہونے کے وہ قائل ہیں لیکن بحالات موجودہ مسلح بغاوت کے بغیر بھی تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہ طریق کار یہ ہے کہ آپ کی جماعت دعوت و تنظیم اور تربیت کے کٹھن مراحل سے گزرنے کے بعد پرامن احتجاجی تحریک کے ذریعے حکومت کے سامنے اپنے مطالبات رکھے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ "اس اقدام کا مرحلہ اس وقت آئے گا کہ جب اس انقلابی جماعت کو اپنی امکانی حد تک یہ اندازہ اور معلومات حاصل ہوں کہ ہمارے اپنے زیر اثر اور ہمارے تربیت یافتہ لوگ کہ وہ پرامن طریق پر سڑکوں پر آ سکتے ہیں اور مظاہرے کر سکتے ہیں اور ان کی اخلاقی ساکھ اتنی مضبوط ہے کہ ان کے مظاہروں کے دوران بدامنی کا کوئی حادثہ نہیں ہو گا۔ اور اگر چند شرپسند لوگ بدامنی پر اتر آئیں تو ان کی تنظیمی طاقت اتنی مضبوط ہو کہ ان اشرار کی گردنیں دبوچیں۔ اس کے بجائے کہ حکومت کی انتظامیہ کو ان کی گردنیں دبوچنے کی ضرورت پیش آئے' وہ خود ان پر قابو پا کر انہیں حکومت کے حوالے کریں کہ یہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ یہ تخریب کار عناصر ہیں جو اس پرامن اور عدم تشدد کی اسلامی تحریک کو سبوتاژ اور درہم برہم کرنے کے لئے آگئے ہیں"۔ محترم ڈاکٹر صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "اس انقلابی تنظیم کے تربیت یافتہ جلوس نہ بسوں کو جلائیں گے نہ نیون سائنوں اور ٹریفک سگنلوں کو توڑیں گے نہ ہی وہ کسی نجی یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچائیں گے۔ ان جلوسوں اور مظاہروں کا مطالبہ یہ ہو گا کہ فلاں فلاں کام شریعت کی رو سے منکر ہیں' حرام ہیں' ہم ان کو کسی حال میں نہیں ہونے دیں گے۔ حکومت گرفتار کرے تو مظاہرین کوئی مزاحمت نہیں کریں گے۔ لاٹھی چارج کرے تو اسے جھیلیں گے۔ آنسو گیس کے شیل برسائے تو برداشت کریں گے۔ حتیٰ کہ گولیاں برسائے تو خوشی خوشی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کریں گے۔ لیکن نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ اپنے موقف کو چھوڑیں گے"۔ (منہج انقلاب نبوی' ص ۳۶۶-۳۶۵)

محترم خرم صاحب کے مضمون سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ تمام گروہ جو انتخابات سے ہٹ کر کسی دوسرے طریق کار کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں' وہ مسلح بغاوت پر ہی یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں کہا گیا ہے کہ اس پرامن احتجاجی طریق کار میں یک طرفہ تصادم ہو گا' یعنی حکومت وقت تو انقلابیوں کا خون کرے گی لیکن وہ اپنے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔ چنانچہ اس شبہ کا ازالہ کرنے کے لئے محترم ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں کہ "میں جب انقلابی طریق کار کی بات کرتا ہوں تو بعض حضرات کو یہ غلط فہمی لاحق ہو جاتی ہے کہ میں حکومت کے خلاف بغاوت اور مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں۔ بعض حضرات دانستہ یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہیں حالانکہ میں اپنی متعدد تقریروں میں یہ بات واضح کر چکا ہوں کہ انقلابی طریق کار کا مطلب لازماً یہ نہیں ہے کہ مسلح بغاوت اور تصادم ہو بلکہ موجودہ دور میں یہ بات قریباً خارج از بحث ہے' چونکہ اولاً تو سابقہ ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسی حکومت سے ہے جو قانوناً مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ثانیاً یہ کہ حکومت کے پاس باقاعدہ تربیت یافتہ اور جدید اسلحہ سے لیس فوج موجود ہے جبکہ عوام الناس نہتے ہیں لہٰذا ان دونوں اعتبارات سے فی زمانہ مسلح تصادم اور بغاوت کے راستے معدوم کے درجے میں آتے ہیں چنانچہ اب ہمیں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں وہ طریقہ اختیار کرنا ہو گا جس سے دور جدید کے تمدنی ارتقاء نے لوگوں کو واقف کرایا ہے۔ آج عوام عدم تشدد کے اصول پر پرامن اور منظم مظاہروں کے ذریعے اپنے عزم اور اپنی طاقت کا اظہار کرتے ہیں اس کے لئے ہمیں قرآن و حدیث سے جو رہنمائی ملتی ہے' اسے میں "نہی عن المنکر بالید" سے تعبیر کرتا ہوں" (منہج انقلاب نبوی' ص ۳۶۶)

محترم خرم مراد صاحب نے اپنے اداریہ میں اقامت دین کے لئے جن دو طریقوں یعنی رائے عامہ کو ہموار کر کے بذریعہ انتخابات اور اسلحہ کے زور پر تبدیلی برپا کرنا' کا ذکر کیا ہے' ان کی ناکامی کا حوالہ ان

۶۸ ایمان افروز واقعات پر مشتمل قاضی عبید اللہ حلیم فضلی کی تالیف

توبہ

جو پیر طریقت محترم قاضی محمد حمید فضلی مدظلہ العالی کے حکم پر مرتب کی گئی

خود پڑھئے اور احباب کو تحفہ میں دیجئے

سفید کاغذ' کمپیوٹر کتابت' عمدہ طباعت' مضبوط جلد' قیمت صرف -/۱۰۰ روپے

شائع کردہ: ادارہ فیوضات مجددیہ خانقاہ فضلیہ' شیر گڑھ' مظفر گڑھ

نوٹ: یہ کتاب مکتبہ انجمن ۳۶-کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے

الفاظ میں دیا ہے کہ "پرامن اعلائے کلمۃ اللہ میں یقیناً کامیابی نہیں ہو رہی' اور دیر لگ رہی ہے' لیکن کیا مسلح جدوجہد کے ذریعے سے کامیابی ہو رہی ہے' یا جلد منزل ہاتھ آتی نظر آ رہی ہے؟ اگر ایک طرف الجیریا' ترکی اور پاکستان میں ناکامی کی مثالیں ہیں' تو دوسری طرف مسلح جدوجہد کے باوجود شام' مصر' افغانستان اور خود الجیریا میں بھی ناکامی کی مثالیں موجود ہیں۔ یقیناً جہاں پرامن ذرائع سے کام ہو رہا ہے وہاں غلط حکومتیں قائم ہیں' اور بگاڑ بڑھ رہا ہے۔ لیکن جہاں طاقت استعمال ہو رہی ہے' کیا وہاں حکومتیں گر رہی ہیں اور بگاڑ کم ہو رہا ہے؟"

جناب خرم مراد صاحب کا تجزیہ نہایت حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم نے اس حوالے سے عرض کریں گے کہ یہ دونوں راستے کامیابی کی طرف نہیں جاتے' نہ انتخابات' نہ ہی مسلح تصادم' اور جیسا کہ محترم خرم مراد صاحب نے ذکر کیا ہے اور ان کی کامیابی کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ایرانی انقلاب کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ ہم نے جس طریق کار کا ذکر کیا ہے وہ آج سے پندرہ سال قبل ہمارے ہمسایہ برادر ملک ایران میں کامیابی سے ہم کنار ہو چکا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ایرانی انقلاب عہد حاضر کا بہت بڑا کارنامہ ہے جو ہمارے ایرانی بھائیوں نے پرامن احتجاجی تحریک کو بروئے کار لاتے ہوئے سرانجام دیا ہے' جس کا محترم خرم مراد صاحب نے ذکر تک نہیں کیا۔

محترم ڈاکٹر صاحب ایرانی انقلاب کا حوالہ دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "اس کا سب سے بڑا نمونہ ہمارے سامنے شہنشاہ ایران کا انجام ہے۔ وہ شاہ ایران جس کے پاس ایشیا میں سب سے بڑا اسلحہ خانہ تھا' جس کے پاس ساوک جیسی سفاک پولیس تھی' جس کے مقابلہ کی سفاک پولیس کسی کمیونسٹ ملک میں تو شاید موجود ہو' باقی دنیا میں اس کے مقابلے کی کوئی پولیس موجود نہیں ..... جس طرح کے مظالم اس ایرانی پولیس نے ڈھائے ہیں اور جس خوفناک قسم کی اذیتیں (Tortures) اس نے دیئے' اس کی مثال موجودہ دور کے کسی ملک میں مشکل ہی سے ملے گی۔ لیکن شہنشاہ ایران' جو خود کو "آریہ مہر" کہلواتا تھا' جو سائرس ثانی بننے کا خواب دیکھ رہا تھا' اس کی ساری طاقت' اس کا سارا دبدبہ ان سرفروشوں کی قربانیوں کے آگے خس و خاشاک کی طرح بکھر کر رہ گیا جو اس کے خلاف مظاہروں کی صورت میں جان دینے کے لئے سڑکوں پر آ گئے تھے۔ اس کی پولیس عاجز آ گئی اور فوج نے ان مظاہرین پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کو اپنا ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا"۔ (منہج انقلاب نبوی' ص ۳۸۲)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ الجزائر اور مصر و شام میں مسلح تصادم سے انقلابی تحریکوں کو کچلا جا رہا ہے جبکہ ایران میں پرامن احتجاجی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہو گئی' اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کا سبب صاف ظاہر ہے کہ جب آپ جوابی مسلح کارروائی کریں گے تو وہاں کی فوج اور پولیس کو اخلاقی اور قانونی جواز حاصل ہو جائے گا کہ آپ کی تحریک کو کچل دے۔ نیز وہ اپنی جانوں کی حفاظت کے لئے بھی جوابی کارروائی کرے گی' لیکن اس کے برعکس اگر آپ پرامن ہیں تو وہ ایک حد تک ہی آگے جائے گی جیسا کہ ایران میں ہوا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ "اگر یہ معاملہ ہو جائے اور یہ مرحلہ آ جائے تو یہ بات جان لیجئے کہ آخر تا کے۔ اس مسلمان ملک کی مسلمان پولیس کب تک لاٹھیاں برسائے گی اور مسلمان فوج کب تک گولیاں چلا کر ان نہتے مظاہرین کو مارے گی جو صرف اللہ کے لئے منکرات کے خلاف نکلے ہوں۔ پھر یہ فوج کتنوں کو مارے گی .....!! یہ بات بھی اچھی طرح جان لیجئے کہ کوئی جابر سے جابر حکمران بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا"۔ (منہج انقلاب نبوی' ص ۳۸۱)

> **"عہد حاضر میں اسلامی انقلاب کیلئے نبی اکرمؐ کے بنیادی منہج کو تو جوں کا توں اختیار کرنا ہو گا لیکن آخری مرحلہ سر کرنے کیلئے عہد حاضر کے سماجی' سیاسی و عمرانی ارتقاء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اجتہاد کی ضرورت ہے"**

دو طرفہ مسلح تصادم میں اسلامی انقلابی جماعت کے کارکنوں کے کچلے جانے کی دوسری اہم وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب وہ فوج اور پولیس کو قتل کرتے ہیں تو عوامی حمایت سے محروم ہو جاتے ہیں اس لئے کہ وہ مقتولین اسی معاشرے کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ جب کسی تحریک کی پشت پر عوامی ہمدردی اور حمایت نہ ہو تو اس کی کامیابی کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب اس نکتے کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں "جب ایک منظم انقلابی جماعت راہ حق میں جان دینے کے لئے آمادہ ہو جائے' تو اسے ملک کے عوام کی اتنی اخلاقی اور عملی حمایت حاصل ہو جاتی ہے کہ پھر اسے کچلنا اور ختم کر دینا آسان نہیں رہتا۔ ایسی جماعت کو بغاوت کا اعلان کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی نہ ہتھیار اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے"۔ (منہج انقلاب نبوی' ص ۳۸۲)

محترم خرم صاحب نے اپنے ادارتی مضمون میں الجزائر اور ترکی کی مثال پیش کی ہے' اور یہ مثال جمہوری اور آئینی طریقے سے تبدیلی کے حق میں جماعت اسلامی اکثر پیش کیا کرتی ہے۔ اس ضمن میں ہم محترم خرم مراد صاحب کی توجہ دو باتوں کی طرف مبذول کرائیں گے۔ الجزائر میں "اسلامی نجات پارٹی" کی کامیابی کی پہلی وجہ یہ تھی کہ آزادی کے بعد اس ملک کے سوشلسٹ بلاک میں چلے جانے کی وجہ سے' یہاں جاگیرداری کو ختم کر دیا گیا لہٰذا ہمارے ملک پاکستان کی طرح وہاں جاگیرداروں پر مشتمل سیاسی طبقہ نہ ابھر سکا۔ دوسری بات یہ کہ الجزائر میں تقریباً ایک ہی فقہی مسلک پر مشتمل لوگ ہیں جبکہ اس کے برعکس پاکستان میں فرقہ واریت کی وجہ سے بیسیوں سیاسی جماعتیں ہیں۔ لہٰذا ان دو وجوہات کی بنا پر وہاں انتخابی طریقے سے کامیابی ہوئی لیکن یہ کامیابی چونکہ کسی انقلابی طریق کار کو اختیار کرتے ہوئے نہیں ہوئی تھی' اس لئے مغربی طاقتوں نے مداخلت کر کے اسلامی ریاست وجود میں نہ آنے دی۔ مغربی طاقتوں کے اشارے پر ناچنے والے بے دین صدر شاذلی بن جدید نے انتخابات کے بعد مستعفی ہو کر مصنوعی آئینی بحران پیدا کر دیا جس کی وجہ سے فوج کو مداخلت کرنا پڑی' جس کے مظالم تاحال ختم نہیں ہوئے۔ الجزائر کے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری دینی سیاسی جماعتوں کو سبق لینا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ یہاں پر بھی جو طبقہ سیاسی اعتبار سے سیاہ و سفید کا مالک ہے وہ الجزائر کے حکمرانوں کی طرح گردن تک مغربی تہذیب میں غرق ہے لہٰذا اگر کسی موقع پر یہاں انتخابی راستے سے کامیابی کے امکانات پیدا ہوئے بھی تو مغربی طاقتیں اسلام پسندوں کا راستہ روکیں گی اور یہاں بھی خون کی ندیاں اسی طرح بہائی جائیں گی جس طرح الجزائر میں بہائی جا رہی ہیں۔

محترم خرم مراد صاحب نے جن ممالک میں مسلح جدوجہد کا حوالہ دیا ہے' مثلاً مصر' شام اور الجزائر' اگر غور سے دیکھا جائے تو ان ممالک میں بھی دینی جماعتوں

نے مسلح تصادم باقاعدہ بغاوت کی شکل میں اور کھل کر نہیں کیا ہے۔ ان کی ان کارروائیوں کے لئے مناسب اصطلاح چھاپہ مار خفیہ جنگ کی استعمال کی جانی چاہئے۔ یہ طریقہ واردات انتخابات سے بھی کہیں زیادہ مہلک ہے۔ پھر اسلام بھی اس طرح کی کارروائیوں کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ بے گناہ شہریوں کو بموں سے اڑادیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی جماعت کسی بس کو بم کے ذریعے اڑا دیتی ہے یا کسی دوسرے ملک میں قائم اپنی حکومت کا سفارت خانہ تباہ کر دیتی ہے تو اس سے اسلام کا غلبہ تو نہیں ہو گا اور نہ ہی اس بس میں بیٹھنے والے ہی اسلام کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعتاً مسلح تصادم کا راستہ اختیار کرنا چاہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اعلانیہ طور پر' کھلم کھلا بغاوت کرے تاکہ حکومت کو بھی معلوم ہو جائے کہ کون لوگ یہ راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور عوام بھی باخبر ہوں۔ ظاہر ہے ایسی شکل میں جنگ دوبدو ہو گی۔ میری ناقص رائے میں اس وقت اس طرح کا طریقہ افغانستان میں "طالبان" نامی تنظیم نے کیا ہے' نتیجتاً اسے ۱۳ صوبوں میں مکمل کامیابی بھی حاصل ہو چکی ہے۔ اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑتے کہ یہ تنظیم کس نے قائم کروائی' کون اس کی مدد کر رہا ہے اور اس کے مقاصد کیا ہیں' ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ "طالبان" کی کارروائیوں کو مسلح بغاوت کا نام دیا جا سکتا ہے' مصر' شام اور الجزائر میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ دہشت گردی ہے اور چھاپہ مار خفیہ کارروائیاں ہیں' جس سے نہ اسلام کا بھلا ہو گا نہ ہی ان جماعتوں کا۔

محترم خرم مراد صاحب فرماتے ہیں کہ "جب تک پرامن ذرائع سے دعوت پہنچانے' منوانے اور اجتماعی تبدیلی لانے کے راستے کھلے ہوئے ہوں' اور جس وقت تک رائے عامہ اسلامی انقلاب کی پشت پناہی کے لئے تیار نہ ہو' اس وقت تک اسلحہ اٹھا کر جہاد کرنا صحیح نہیں ہو گا۔ ہم ان کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی کوئی پائیدار تبدیلی آئے گی وہ عوام کی تائید سے ہی آئے گی۔ لیکن ہمیں اس بات سے اختلاف ہے کہ اس رائے عامہ کا لازماً اظہار انتخابات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ہم اس بحث میں پڑے بغیر کہ انتخابات کے ذریعے کسی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی لائی بھی جا سکتی ہے یا نہیں' یہ عرض کریں گے کہ اس ملک میں رائے عامہ آزاد کب ہے۔ ہم یہی رونا تو روتے ہیں کہ اس ملک کی ستر فیصد آبادی جاگیرداروں کے "قبضہ قدرت" میں ہے۔ وہ اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کر کب سکتے ہیں؟ لہٰذا پاکستان کے مخصوص طبقاتی نظام میں ضروری ہے کہ پہلے کسی انقلاب طریق کار کے ذریعے عوام کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی غلامی سے آزادی دلوائی جائے۔ اگر ہم یہ بات مان بھی لیں کہ لوگوں میں اسلامی نظام کی برکات کا شعور اجاگر ہو چکا ہے اور وہ دینی جماعتوں کی تائید کرتے ہیں' تب بھی موجودہ حالات میں وہ اپنے اس شعور کے مطابق رائے کے اظہار میں آزاد نہیں ہیں۔

امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے ہماری رہنمائی جس طریق انقلاب کی طرف مبذول کروائی ہے اور جو بنیادی طور پر سیرۃ النبی سے ماخوذ ہے' اس کے مطابق بھی انقلاب کے لئے عوامی تائید و نصرت لازمی ہے لیکن معاشرے کی اکثریت کا بالفعل تبدیل ہو جانا اور اس انقلابی جماعت کے ساتھ عملاً شریک ہونا یا ذہناً متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا' بلکہ یہ ممکن بھی نہیں ہے۔ انقلاب ہمیشہ ایک مضبوط منظم اقلیت کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے' ہم عوام کے ایک قابل ذکر طبقے کی تائید و نصرت کے حصول کے لئے اسلامی انقلابی جماعت کو بہت بڑے پیمانے پر دعوت و تبلیغ کا کام کرنا ہو گا۔ لیکن اس تائید و نصرت کا اظہار انتخاب کے ذریعے نہیں ہو گا بلکہ اس وقت ہو گا جب اسلامی انقلابی جماعت اپنے نظم و ضبط کی قوتوں کو بروئے کار لا کر میدان عمل میں قربانیوں کی داستان رقم کر رہی ہو گی۔

آخر میں' میں عرض کروں گا کہ عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تنظیم اسلامی' جماعت اسلامی کو انتخابات کا راستہ ترک کرنے کا مشورہ دیتی رہی ہے۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

بقیہ : واقعات عالم

زیادہ تعداد میں لوگوں نے رفاہ پارٹی کو کیوں ووٹ نہیں دیئے۔

رفاہ پارٹی کی انتخابات میں اچھی کارکردگی کی ایک اور وجہ اس کی منظم طور پر چلائی جانے والی انتخابی مہم تھی جس میں صرف استنبول میں تین لاکھ پارٹی کارکنوں نے حصہ لیا اور گھر گھر جا کر غریب عوام کو پارٹی کے حق میں متحرک کیا۔ شیلر اور دوسرے اہم سیاسی راہنماؤں کا خیال ہے کہ وہ اس ماہ مخلوط حکومت ترتیب دے کر رفاہ پارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے' لیکن انتخابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام ان راہنماؤں کو بخشنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔

بقیہ : گاہے گاہے باز خواں....

قوم پرست مسلمان ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ ان کی یہ تجویز کہ ہندوستان کے آئین میں مسلمانوں کو اپنی حیثیت کا تعین خود کرنے کا موقع دیا جائے' جناح کے حق خود اختیاری کے دعوے کا دراصل توڑ تھا۔ ورنہ اس وقت کی طبقاتی صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمان مخلوط انتخابات کا اصول قبول نہ کرتے۔ تاہم مولانا آزاد کی سکیم مسلمانوں کے لئے کتنی ہی پرکشش ہوتی' جناح اور مسلم لیگ کو مطمئن کرنا مشکل تھا۔

گاندھی کا جوابی خط

گاندھی کا آزاد کے نام ۱۶/ اگست کا جوابی خط یہ تھا:

آج آپ کا خط ملنے پر میں نے درج ذیل تار آپ کے نام دیا ہے۔

"میرے خیال میں آپ کا خط شائع نہیں ہونا چاہئے۔ مفصل خط تحریر کر رہا ہوں۔"

آپ کے خط سے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کا اشارہ میری ہندو قوم کی طرف ہے۔ آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہے کم از کم آپ کے خط میں اس کا اظہار نہیں ہو سکا' لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ اگلی دفعہ جب ملاقات ہو گی تو آپ چاہیں گے تو بات کر لیں گے' تاہم طبقاتی مسائل کے بارے میں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں' ورکنگ کمیٹی سے مشورہ کئے بغیر ہرگز نہ کہیں۔ میری رائے بہرحال یہ ہے کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے۔ پارٹی اگر چاہے گی تو آپ سے رائے طلب کر لے گی' یہ پارٹی کا درد سر ہے اور یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے۔ میری رائے آپ کی رائے سے مختلف ہے۔ میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تصفیہ کرانے کی حیثیت میں ہوں۔ ہاں! کانگریس اگر کچھ کرنا چاہے تو اس کی بات اور ہے۔ مجھے آپ کی یہ تجویز اچھی نہیں لگی کہ (ریاستی سربراہ) باری باری ہندو اور مسلمان ہو۔ اس طرح باقی طبقے کہاں جائیں۔ یہ تمام باتیں گہرے غور و فکر کی متقاضی ہیں۔ مجھے جلد بازی سے کام لینے کی عادت نہیں۔ (ختم شد)

مولانا آزاد کو یہ خط پڑھ کر جو مایوسی ہوئی ہو گی اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

(بشکریہ : "مسلم انڈیا" دسمبر ۱۹۹۵ء)

پارلیمانی طرز حکومت بہت سی کمزوریوں کا حامل ہے

صدارتی طرز حکومت سے ہارس ٹریڈنگ اور فیوڈل طبقہ کی گرفت سے بچا جا سکتا ہے

ملک کے سیاسی استحکام کے لئے صدارتی نظام اور چھوٹے صوبوں کے قیام پر غور ہونا چاہئے

معروف صحافی و دانشور جناب ارشاد احمد حقانی کی صدارتی نظام کے حق میں ایک مدلل تحریر

پارلیمانی طرز حکومت کی یہ کمزوری تو بہت عرصے سے ہم پر واضح تھی کہ اس میں چونکہ حکومت کا انحصار قومی اسمبلی میں اپنی اکثریت برقرار رکھنے پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اسے ارکان کی بلیک میلنگ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے کرپشن کو فروغ ملتا ہے قانون اور آئین اور میرٹ کی مٹی پلید ہوتی ہے اور بعض اوقات نہ چاہنے کے باوجود حکومت وقت کو ارکان اسمبلی کی ناجائز اور خلاف اخلاق و قانون خواہشات پوری کرنی پڑتی ہیں۔ ترقی پذیر جمہوری ممالک میں جہاں بھی پارلیمانی نظام رائج ہے مذکورہ خرابی اور مذکورہ کمزوری کہیں کم اور کہیں زیادہ بہرحال موجودہ رہتی ہے۔ ان ممالک میں سے جن میں جمہوری روایات اور اخلاقیات نسبتاً پختہ ہوں وہاں یہ بیماری اور کمزوری کچھ کم ہوتی ہے اور جہاں ابھی جمہوری اخلاقیات مستحکم نہ ہوئی ہوں وہاں یہ مرض مزمن اور سنگین صورت اختیار کر جاتا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان ایسے ہی ممالک میں شامل ہے اور کرپشن کا جو کلچر جنرل ضیاء الحق کے دور میں عروج کو پہنچا وہ اس وقت اپنی پوری "آب و تاب" سے ہمارے ہاں موجود ہے۔ ارکان اسمبلی (قومی اور صوبائی) حکومت کے لئے اپنی حمایت کی قیمت نت نئی شکلوں میں مانگتے اور وصول کرتے رہتے ہیں۔ اس میں یقیناً متعدد معزز مستثنیات بھی ہیں اور سبھی ارکان کا رویہ ایک جیسا نہیں۔ جب ۱۹۸۵ء کی غیر جماعتی اسمبلی وجود میں آئی تھی تو پیرپگاڑا نے ارکان کی مصروفیات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ وفاقی سیکرٹریٹ' پی ایم سیکرٹریٹ اور وزیراعظم ہاؤس کے ایک کمرے سے نکلتے ہیں اور دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور حکومت کی سیاسی تائید کرنے کی قیمت خوب خوب وصول کر رہے ہیں۔

میں نے اس وقت (غیر جماعتی بنیاد پر منتخب ہونے والے) ارکان اسمبلی کے رویئے اور ان کی طرف سے آٹھویں ترمیم کی حمایت کا تذکرہ کرتے ہوئے پیرپگاڑا کے مذکورہ فقرے کا حوالہ دے دیا جس پر دو ارکان اسمبلی شیخ رشید احمد (اسیر بہاولپور جیل) اور اوکاڑہ کے میاں زمان نے میرے خلاف قومی اسمبلی میں تحریک استحقاق پیش کر دی اور دلیل یہ دی کہ میرے تبصرے سے ارکان قومی اسمبلی بلکہ ایوان کا استحقاق مجروح ہوا ہے حالانکہ میں نے ان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا وہ میرا اپنا تبصرہ نہ تھا میں نے پیرپگاڑا کے بیان کا حوالہ دیا تھا۔ میں نے اس واقعے کا ذکر یہ واضح کرنے کے لئے کیا ہے کہ پارلیمانی نظام میں ارکان اسمبلی کے لئے حکومت سے اپنے جائز ناجائز مطالبات منوانے کے لئے دباؤ ڈالنا آسان ہوتا ہے اور اگر ان پر جماعتی ڈسپلن کی گرفت نہ ہو جیسا کہ ۱۹۸۵ء کی اسمبلی کے شروع کے زمانے میں نہیں تھی تو ارکان کا ذاتی مفادات کے لئے حکومت پر دباؤ ڈالنا اور بھی زیادہ معمول کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ پارٹیوں کی موجودگی میں بھی یہ کیفیت کچھ ایسی کم نہیں ہوتی۔ جو لوگ اندر کے حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ پارلیمانی نظام کے وزرائے اعظم کس طرح اکثریت جمع کرتے اور قائم رکھتے ہیں۔ میں واضح کر دوں کہ میں ایک عمومی اور اصولی بات کر رہا ہوں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس تبصرے کی وجہ سے پھر میرے خلاف کوئی تحریک استحقاق پیش کر دی جائے۔ میں پارلیمانی نظام کی ایک معلوم زمانہ کمزوری کا ذکر کر رہا ہوں افراد سے بحث نہیں کر رہا اس لئے کسی رکن اسمبلی کو ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ بعض لوگ پارلیمانی نظام کو مذکورہ کمزوری کو کہ وزیراعظم کو ہر وقت اپنے ارکان کی خوشنودی کی فکر کرنی پڑتی ہے اس نظام کی ایک خوبی بھی سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اگر حکومت ارکان کی خوشنودی کی دست نگر رہے گی تو ان کے اور ان کے حلقوں کے کام کرے گی ورنہ انہیں نظرانداز کر دے گی۔ یہ دلیل اپنے اندر یقیناً کچھ وزن رکھتی ہے لیکن یہ بات کوئی راز نہیں کہ بعض ارکان اپنی حمایت کی قیمت صرف جائز کاموں کی صورت میں ہی نہیں ناجائز کاموں کی صورت میں بھی وصول کرتے ہیں۔ پارلیمانی نظام کی یہ کمزوری ہمیشہ سے موجود اور معلوم ہونے کے باوجود بہت سے سیاسی مبصر اس کی حمایت اس دلیل کی بنیاد پر بھی کرتے رہے ہیں کہ اس نظام میں وفاقی اکائیوں کے نمائندوں کو اقتدار میں شراکت کا احساس رہتا ہے۔ چونکہ اسمبلی ہی اقتدار کا

> **"میں اختیارات کے عدم مرکزیت کا بہت زبردست حامی ہوں اور موجودہ نظام میں اختیارات کے ارتکاز کی جو شکل مرکز اور صوبائی دارالحکومتوں میں پائی جاتی ہے اسے سخت نقصان دہ سمجھتا ہوں دس یا بارہ صوبے بننے سے یہ مرکزیت ختم ہو جائے گی"**

سرچشمہ اور طاقت کا منبع ہوتی ہے اس لئے صوبائی نمائندے اس کا حصہ ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو اقتدار میں شریک سمجھتے ہیں اور اس احساس کی موجودگی صوبوں کو مطمئن رکھنے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ میں نے بھی مذکورہ دلیل ہی کی وجہ سے پارلیمانی نظام کو ہمیشہ پاکستان کے لئے لائق ترجیح سمجھا ہے لیکن اس وقت عملاً سیاسی کرپشن اور پارلیمانی بلیک میلنگ کی جو کیفیت پیدا ہو چکی ہے وہ مجھے اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنے اور یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ پارلیمانی نظام ہی جاری رہنا چاہئے یا ہمیں اس پر نظر ثانی کرنے چاہئے۔

ایک اور پہلو جو غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے وہ یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ بالخصوص قومی اسمبلی اسی طرح فیصلہ کن اہمیت کی حامل رہے جیسے پارلیمانی نظام میں ہوتی ہے تو ملک میں فیوڈل سسٹم کی موجودگی کی وجہ سے اکثر ارکان اسمبلی کو محفوظ حلقہ ہائے انتخاب کی صورت میں جو تحفظ حاصل ہے وہ بھی پوری طرح برقرار رہتا ہے اور ملک کی قسمت انہی محفوظ حلقوں سے منتخب ہونے والے ارکان کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔ اب بظاہر بحالات موجودہ زرعی اصلاحات کے نفاذ اور فیوڈل عناصر کی اپنے اپنے حلقوں پر گرفت ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں اس لئے غور طلب سوال یہ ہے کہ ان ارکان اسمبلی کی طاقت اور اثر آفرینی کو توڑنے کی کیا شکل ممکن ہے۔ اس کا ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ یہ ارکان جن اسمبلیوں میں جاتے ہیں اور جن پر ان کی گرفت مضبوط ہے ان اسمبلیوں ہی کو نسبتاً کم بااختیار کر دیا جائے جس کی ایک شکل یہ ہے کہ صدارتی نظام اختیار کر کے اسمبلیوں کا کام صرف قانون سازی رہنے دیا جائے اور حکومت وقت کے استحکام اور استقرار کو ان کی حمایت سے آزاد کر دیا جائے۔ پارلیمانی نظام میں قومی اسمبلی ہی تمام اختیارات کا منبع ہوتی ہے۔ وزیراعظم کے اختیارات اسی کے مرہون منت ہوتے ہیں لیکن صدارتی نظام میں اسمبلی صرف قانون سازی کا کام کرتی ہے حکومت کو بنانے یا بگاڑنے میں اس کا براہ راست عمل دخل نہیں ہوتا۔ چونکہ ملک کا فیوڈل طبقہ پارلیمانی نظام میں بہت زیادہ بااثر ہوتا ہے اور وہ زرعی اصلاحات کے لئے بھی تیار نہیں تو اس کا اثر اور غلبہ اور گرفت کم کرنے کے لئے اسمبلیوں کا اختیار ہی کم کر دیا جانا چاہئے۔ یہ ان لوگوں کو نسبتاً غیر موثر کرنے کا ایک راستہ اور ایک طریقہ ہے۔ میرے نزدیک ارکان کی بلیک میلنگ کی استعداد کے علاوہ پارلیمانی نظام کو تبدیل کرنے کے حق میں دوسری دلیل یہ ہے کہ ایسا کرنے سے منتخب ارکان کی اہمیت اور طاقت اور Nuisance Value نافی حد تک کم ہو جائے گی۔ ہاں صدارتی نظام اپنانے کے خلاف یہ ایک بڑی اہم دلیل ہے کہ ملک کا ایک صوبہ نصف سے بھی زیادہ آبادی رکھتا ہے اور جب صدر بالغ رائے دہی کی بنیاد پر چنا جائے گا تو بڑے صوبے کو عملاً ویٹو پاور حاصل ہو جائے گی۔ یہ بڑی وزنی دلیل ہے کیونکہ اس سے چھوٹے صوبوں میں احساس محرومی پیدا ہوگا۔ صدر صرف مملکت کا علامتی صدر نہیں ہوگا موثر اور بااختیار صدر ہوگا اور پوری انتظامی مشینری اس کے تابع ہوگی۔ اس مشکل کا حل یہ ہے صوبوں کی تعداد بڑھا دی جائے اور کسی ایک صوبے کو اس وقت جو ویٹو حاصل ہے اس کا ازالہ کر دیا جائے لیکن دس یا بارہ صوبے بنانے کے خلاف (سیاسی اور جذباتی دلائل کے علاوہ جو یکسر غیر اہم بھی نہیں ہیں) سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ۱۲ صوبوں میں صوبائی سطح کی انتظامیہ قائم کرنے سے اخراجات کا بہت بڑا بوجھ عوامی خزانے پر پڑ جائے گا۔ میں اختیارات کے عدم مرکزیت کا بہت زبردست حامی ہوں اور موجودہ نظام میں اختیارات کے ارتکاز کی جو شکل مرکز اور صوبائی دارالحکومتوں میں پائی جاتی ہے اسے سخت نقصان دہ سمجھتا ہوں دس یا بارہ صوبے بننے سے یہ مرکزیت یقیناً کم ہو جائے گی لیکن ملک میں ۱۲ صوبائی حکومتیں قائم ہونے سے اخراجات میں نمایاں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ اس مشکل کا حل تلاش کرنا بھی ناممکن نہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر صوبے کی انتظامیہ اتنی ہی بڑی اور اتنی ہی مہنگی ہو جتنی موجودہ صوبائی انتظامیہ مہنگی ہے۔ ان اخراجات کو معتدبہ حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ اگر مرکز کے لئے صدارتی نظام اپنایا جائے تو صوبوں میں بھی صوبائی سربراہ براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا جانا چاہئے۔ ایسا کرنے سے کرپشن کے عنصر کو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ ارکان صوبائی اسمبلی کی طاقت میں بھی یکدم کمی ہو جائے گی اور صوبائی سربراہ کے لئے نسبتاً بہتر حکومت دینا ممکن ہو جائے گا۔ اگر ہم زرعی اصلاحات کے ذریعے ملک کے فیوڈل طبقے کی طاقت کم کرنے کی پوزیشن میں نہیں تو اس کالم میں تجویز کردہ نظام کے ذریعے اس کی طاقت میں نمایاں کمی کی جا سکتی ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ملک کی فیوڈل لابی صدر کے انتخاب پر فیصلہ کن انداز میں اثر انداز نہیں ہو سکے گی جیسی وہ پارلیمانی نظام میں وزیراعظم کے انتخاب میں ہوتی ہے۔ بہرکیف ان خطوط پر اب سوچ بچار کو آگے بڑھایا جانا چاہئے کیونکہ موجودہ پارلیمانی نظام کی خرابیاں بالکل ناقابل اصلاح دکھائی دینے لگی ہیں اور اس کے ذریعے مراعات یافتہ لابیوں کا غلبہ ٹوٹنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مراعات یافتہ لابیوں کے غلبے کے کیا نقصانات ہیں اس سے ہر شخص واقف ہے اور اس وقت ان کی تفصیل بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ یہی مراعات یافتہ لابیاں ملک کے اندر عدل اجتماعی کے اہتمام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں اور ان کی گرفت سے نکلنے یا کم از کم اسے کمزور کرنے کی کوئی تدبیر ضرور سوچی جانی چاہئے۔OO

(بشکریہ : روزنامہ "جنگ" ۵ دسمبر ۹۵ء)

"میں نے پارلیمانی نظام کو ہمیشہ کے لئے پاکستان کے لئے لائق ترجیح سمجھا ہے لیکن اس وقت عملاً سیاسی کرپشن اور پارلیمانی بلیک میلنگ کی جو کیفیت پیدا ہو چکی ہے وہ مجھے اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنے اور یہ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے کہ پارلیمانی نظام ہی جاری رہنا چاہئے یا ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہئے"

بقیہ : ابلاغیات

مغربی تہذیب کے برعکس اسلام نے جو ثقافتی اقدار دی ہیں ان کو فروغ دیا جائے۔ اسلامی ثقافتی اقدار بے حیائی، عریانی، فحاشی اور بے ہودگی سے پاک ہیں۔ یہ اقدار انسان کو حیوانیت کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھا کر اشرف المخلوقات کی بلندیوں پر فائز کرتی ہیں نیز معاشرتی زندگی کو شرم و حیاء اور عزت و آبرو کے ذریعے جلا بخشتی ہیں۔

مرزا ندیم بیگ

اسلامی جذبہ ہی پاکستان کو مستحکم رکھ سکتا ہے!

ضیاء الحق مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے نفاذ اسلام کا سنہری موقع عطا کیا تھا لیکن...

دینی جماعتوں کی سست روی اور مرحوم ضیاء الحق کی سست روی کو ایک قرار دینا مناسب نہیں

اگر پاکستان کو بھی "جدید اسلامی ریاست" کا ماڈل تلاش کرنے کی ضرورت ہے تو پھر اس کے قیام کا مقصد کیا تھا؟

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے قریبی ساتھی جنرل رفاقت کے انٹرویو پر جناب محمد سمیع کا اظہار خیال

وطن عزیز کا قیام اسلام کے نام پر عمل میں آیا تھا' اس کی بقا اور اس کا استحکام بھی اسلام ہی پر منحصر ہے۔ پاکستان کی تاریخ پر غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جب تک پاکستان میں اسلامی جذبہ برقرار رہا' ملک مستحکم رہا۔ اس بات کا بین ثبوت ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کا واقعہ ہے' جب ہم سے دس گنا بڑے وسائل رکھنے والے ملک نے ہم پر حملہ کیا تو ساری قوم اس وقت کے صدر ایوب خان کی پکار پر متحد ہو گئی کیونکہ اس پکار کی بنیاد کلمہ طیبہ تھی۔ اس کے برعکس ۱۹۷۱ء کی جنگ میں وہ جذبہ پیدا نہ ہو سکا کیونکہ قوم ایک طرف لسانی قومیت کے علمبرداروں کے قبضے میں تھی تو دوسری طرف یحییٰ خان جیسا فاسق و فاجر حکمران قوم پر مسلط تھا جس کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز کا قوم پر کیا اثر ہو سکتا تھا۔ نتیجہ انگریزی کی اس ضرب المثل کی منہ بولتی تصویر کی صورت میں ہمارے سامنے تھا یعنی

"United you stand divied you fall"

"پوری قوم کافروں کے مقابلے میں سخت تھی سقوط ڈھاکہ قوم کا مقدر بن گیا"۔

جب یہ بات طے ہے کہ ملک کا قیام' اس کی بقا اور اس کا استحکام سب کچھ اسلام پر ہی منحصر ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ یہاں اسلام کے غلبہ کی جدوجہد جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اول دن سے یہ جدوجہد جاری ہے۔ علماء اپنے دارالعلوموں اور خانقاہوں میں لوگوں کے عقائد کی حفاظت اور ان کے تزکیے کے عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مسجدوں کے محراب و منبر سے اسلامی تعلیمات پر خطابات جاری ہیں۔ سیاسی مذہبی جماعتیں ملک میں رائج انتخابی نظام کے ذریعہ اقتدار تک پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں تاکہ ملک میں اسلامی شریعت کو جاری و ساری کیا جا سکے۔ ہاں ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اسلام یہاں انتخابات کے راستے سے ہرگز نہیں آئے گا بلکہ اس کے لئے انقلابی جدوجہد کے طریقے کو اپنانا ہو گا۔ یہ گروہ اب اپنا حلقہ اثر بتدریج بڑھانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے اقتدار کی کشمکش میں اپنی شرکت کبھی گوارا نہ کی اور وہ بھی ہیں جنہوں نے اس راستہ کو اپنایا لیکن نتائج سامنے آنے پر انہیں محسوس ہوا کہ یہ راستہ اسلامی انقلاب کو پہنچانے والا نہیں ہے۔ یوں تو مذہبی سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی اکثریت بھی اب اس بات کی قائل ہوتی جا رہی ہے کہ اسلام کا راستہ انقلاب کا راستہ ہے لیکن برا ہو ان کے ان قائدین کا جو اس مصرع کی عملی تصویر بنے ہوئے ہیں کہ "چھٹتی نہیں ہے کافر منہ سے لگی ہوئی"۔ سیاسی مراعات اور اس حوالے سے لوگوں میں ان کی عزت ان کے پاؤں کی بیڑی بنی ہوئی ہے۔ گو کہ دل سے وہ بھی اس کے قائل ہو چکے ہیں اور بسا اوقات یہ بات ان کی زبان پر بھی آ جاتی ہے لیکن اقتدار کی کشمکش سے وہ نکلنے کو تیار نہیں۔

> **"سیاسی مراعات اور اس حوالے سے لوگوں میں ان کی عزت ان کے پاؤں کی بیڑی بنی ہوئی ہے۔ گو کہ دل سے وہ بھی اس کے قائل ہو چکے ہیں اور بسا اوقات یہ بات ان کی زبان پر بھی آ جاتی ہے لیکن اقتدار کی کشمکش سے وہ نکلنے کو تیار نہیں"**

ان حقائق کی روشنی میں آیئے ہم لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) سید رفاقت کی قیمتی گفتگو کا جائزہ لیتے ہیں جو انہوں نے ہفت روزہ "تکبیر" کے شمارہ ۴ جنوری کو انٹرویو کے دوران کی ہے۔ انہوں نے فرمایا "ہمارے ہاں اسلامی نظام کے آرزو رکھنے والے لوگ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جو اسلامی نظام کی ارفع منزل تک پہنچنے کے لئے نہایت ہی آہستہ روی سے رینگ رینگ کر آگے بڑھنے کے لئے تیار ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر ہمارا آنے والا کل' ہمارے آج سے ذرا سا بھی بہتر ہے اور اسلامی نظام کی طرف تھوڑی سی پیشرفت بھی ہوتی ہے تو اسے غنیمت سمجھا جائے۔ اللہ کی راہ میں ایک قدم آگے بڑھانا بھی نیکی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو ایک

ہی جہت میں مکمل اسلامی نظام کے مقصد کو پانا چاہتا ہے"۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کے دو گروہ موجود ہیں لیکن اسلامی نظام کے مقصد کو پانے کے لئے ان دونوں طریقہ کار میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دینا بہت مشکل ہے۔ گو کہ جنرل صاحب نے آگے یہ فرمایا ہے کہ "لیکن آہستہ رو لوگوں کی بات میں وزن ہے"۔ دراصل آہستہ روی اور تیز روی کی کامیابی اس گروہ کے حوالے سے ہی سمجھی جا سکتی ہے جسے اس کام کا موقع مل گیا ہو۔ دیکھئے!! وہ گروہ جو اسلامی انقلاب کے لئے ایک منظم جماعت کی تشکیل ضروری سمجھتا ہو' جس کے کارکن سمع و طاعت کے جذبے کے ساتھ اپنے امیر کی پکار پر اللہ کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کو تیار ہوں۔ اس کے لئے ست روی ہی ضروری ہے۔ لیکن جو اقتدار میں آ کر اسلام نافذ کرنا چاہتا ہو اس گروہ کے لئے تیز روی ناگزیر ہے۔ جنرل رفاقت نے ضیاء الحق کے لئے ست روی کو Justify کرنے کے لئے اس طریقہ کار کو وزنی گردانا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک ایسا اقتدار نصیب فرمایا تھا جس میں وہ ایک بار "قادر مطلق" کہتے کہتے رک گئے تھے اور ایک بار انہوں نے چیلنج کے انداز میں کہا تھا کہ اتھارٹی میں ہوں یا فلاں... ...جس شخص کو ایسا اقتدار مل جائے اس کے لئے ست روی مناسب نہیں تھی اسی وجہ سے امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں کہ قدرت نے اسے ایک موقع فراہم کیا لیکن اس کے باوجود وہ عمر حاضر کا عمر بن عبدالعزیز نہ بن سکا۔ ضیاء الحق کسی انقلابی جماعت کا لیڈر نہیں تھا۔ اس کے پاس جو کارکن تھے وہ انتہائی بدعنوان اور میکاولی سیاست کے ماہر تھے۔ لہٰذا ان کارکنان نے اس کی ست روی سے فائدہ اٹھایا۔ ملک میں دوہرے نظام کے رواج نے انہیں کھل کھیلنے کا موقع دیا۔ نفاذ اسلام کے لئے اٹھائے گئے ضیاء الحق کے اقدامات میں سے حدود آرڈیننس کو ہی لیجئے۔ شرابی' زانی چور اور ڈاکو جیسے مجرموں کو خال خال ہی کوڑے لگے البتہ سیاستدان' طالب علم اور صحافی حضرات کو کوڑے زیادہ لگے۔ زکوٰۃ آرڈیننس نے پہلے تو شیعہ سنی کی تفریق کو مزید گہرائی بخشی' مزید یہ کہ اس فنڈ کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ نظام صلوٰۃ کے جو مصنوعی مظاہر سرکاری محکموں کے افسران میں اس کے دور میں نظر آئے وہ اس کے جاتے ہی ختم ہو گئے۔ البتہ ایک شے کو فروغ ملا اور وہ ہے منافقت۔

جنرل رفاقت کا یہ کہنا کہ دینی جماعتیں ضیاء الحق کو سادہ آدمی سمجھ کر استعمال کرنا چاہتی تھی یا ضیاء الحق دینی جماعتوں کے لوگوں کو سادہ سمجھ کر استعمال کرنا چاہتے تھے' ان دونوں باتوں کو الگ رکھ کر صرف یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ضیاء الحق کو دینی جماعتوں کے تعاون کی زیادہ ضرورت تھی یا دینی جماعتوں کو ضیاء الحق کے تعاون کی۔ میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت تھی لیکن اصل میں دیکھنا یہ چاہئے کہ اس تعاون کے نتیجے میں زیادہ بھلا کس کا ہوتا۔ ظاہر ہے کہ ضیاء الحق کا ہوتا کہ اگر اسلام کا کچھ بھلا ہو جاتا تو اس کا سہرا اسی کے سر جاتا۔ لہٰذا یہ ضیاء الحق کی ذمہ داری تھی کہ انہیں جو بھی تھوڑا بہت تعاون دینی جماعتوں کا حاصل ہوا تھا اسے بہت زیادہ جانتے۔ بلکہ انہیں تو یہ سوچنا چاہئے تھا کہ

> **"رہی ماڈل والی بات تو اسلامی حکومت کا ماڈل دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے یہ ملک بنایا گیا تھا' اگر ہم ہی دنیا میں ماڈل تلاش کرنے لگے تو دنیا کیا کرے گی!!"**

جو جماعتیں ہرگز نہیں مانتیں کہ ان کے علاوہ کسی دوسری جماعت کے سر پر اسلامی نظام کے نفاذ کا سہرا سجا جائے وہ اس کے سر پر سہرا باندھنے کے لئے تیار تھیں۔ یہ کیا کم غنیمت تھا۔ اصل میں طاقت کا زعم ہی راستے کا پتھر بن گیا۔ کاش کہ ضیاء الحق ایک بار اسلامی نظام کو اس کی عملی شکل میں یکبارگی نافذ کر دیتے اور اسلام کے تعزیراتی قوانین ہی پر زور دینے کی بجائے مکمل اسلامی نظام کے نفاذ کی صورت پیدا کر دیتے تو اس نظام کے برکات کا ظہور لازماً ہوتا۔

رہی بات اس راہ کی دشواریوں کی تو جو بھی اس کے لئے کام کرے گا دشواریاں تو اس کی راہ میں آئیں گی۔ اس ملک میں جب ایسے صدارتی آرڈیننس جاری ہو سکتے ہیں جس کے ذریعہ پولیس کے سامنے اقرار جرم کو عدالت کے لئے قابل تسلیم قرار دیا جاتا ہو تو کیا اسلامی قوانین آرڈیننس کے ذریعہ نافذ نہیں کئے جا سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ انہوں نے کچھ ایسے آرڈیننس جاری کئے بھی لیکن وہ اس لئے کارگر نہ ہوئے کہ صرف قوانین انصاف کی ضمانت فراہم نہیں کرتے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ لوگ قوانین کی خلاف ورزی نہ کریں تو سب سے پہلے ان قوانین پر عملدرآمد کی فضا پیدا کی جائے اور پھر بھی جرائم سرزد ہوں تو ان قوانین کے تحت سزائیں بغیر کسی رو رعایت کے جاری کی جائیں۔ لیکن جہاں سرکاری سرپرستی میں فحاشی و عریانی کا پرچار کیا جا رہا ہو وہاں زنا کی حد جاری کرنا' جہاں دولت چند ہاتھوں میں محدود ہو اور عام آدمی نیم فاقہ کشی اور بیماری سے نیم جانی کی کیفیت میں ہو' وہاں چوری پر ہاتھ کاٹنا عدل نہیں ظلم ہے۔ اور پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ جہاں سنگ زنی کرنے والا خود ہی سنگ باری کا مستحق ہو' وہاں نیم دلی کے عالم میں اپنے اقتدار کے دوام کے لئے اسلام کے چند تعزیری قوانین جاری کرنے کے وہی نتائج نکل سکتے ہیں جو ضیاء الحق کے دور سے اب تک نکلتے چلے آ رہے ہیں۔ رہی ماڈل والی بات تو اسلامی حکومت کا ماڈل دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے تو ملک بنایا گیا تھا۔ اگر ہم ہی دنیا میں ماڈل تلاش کرنے لگے تو دنیا کیا کرے گی!۔

جنرل رفاقت کی یہ بات قابل غور ہے کہ "جب ایران میں انقلاب آیا تو قم نے ملک کے طول و عرض میں فکر و شعور کی شمعیں روشن کر رکھی تھیں۔ اوپر کی سطح سے نیچے کی سطح تک قم کی درس گاہ کا فیض یافتہ فرد موجود تھا۔ ان کے پاس پورا انفرااسٹرکچر موجود تھا۔ فرقہ بندی نہیں تھی۔ قم کا فتویٰ حرف آخر تھا۔ انقلاب کا ایک مرکز و محور تھا۔ ہمارے ہاں ایسے عوامل نہیں"۔ ہمارے ہاں امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد ایران کے انقلاب کی مثال دیتے رہتے ہیں۔ اسی طرح جماعت اسلامی بھی پاکستان میں الجزائر کی مثال دیتی رہتی ہے۔ ان دونوں کے لئے ہی جنرل رفاقت کی بات پر غور کرنے کے لئے کافی مواد موجود ہے۔

جنرل رفاقت کی یہ بات بھی محل نظر ہے کہ دینی جماعتوں کا رول یہ کہ وہ کسی بڑی جماعت سے تعاون کریں تو یہ وہ ماضی میں کرتی رہی ہیں لیکن اس زینہ کے ذریعے ایوان اقتدار میں پہنچ کر ان جماعتوں نے دین کے لئے کیا کیا ہے' یہ سب پر واضح ہے اور شرط تعاون صرف اور صرف اسلامی نظام کا قیام ہو نہ کہ اسمبلی کی سیٹیں ہوں اور نہ وزارت و مشیری۔ اگر اقتدار کی کشمکش سے نکلنا ان کے لئے اتنا ہی ناگزیر ہے تو یہ تمام سیاسی مذہبی جماعتیں ایک سیاسی اتحاد کی صورت میں ایک پلیٹ فارم سے الیکشن لڑیں تاکہ اسلام پسند طبقے کے ووٹ تقسیم نہ ہوں۔OO

☆☆

قاہرہ کانفرنس کے ایجنڈے پر عمل شروع ہو گیا ہے!!

عالمی معیشت پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد یہود کا اگلا ٹارگٹ مسلمانوں کا خاندانی نظام ہے!

ماحولیاتی آلودگی کے مقابلے میں معاشرتی آلودگی زیادہ بڑا مسئلہ ہے

سرکاری سکولوں میں جنسی لٹریچر کی تقسیم مسلمان معاشروں کو شرم و حیا سے عاری کرنے کی جانب پہلا قدم ہے

مسلم معاشرے کے تقریباً تمام اداروں میں کرپشن پیدا کرنے کے بعد یہودیوں کی سازشوں کا شاخسانہ مسلمانوں کا خاندانی نظام بن رہا ہے جو مجموعی طور پر اب تک "In tact" تھا۔ پہلے ایوب خان کے دور میں ٹیلی ویژن کو ملک میں متعارف کروایا گیا۔ بھٹو صاحب کے دور حکومت میں وی سی آر اور اب ڈش انٹینا قدم بقدم عریانی و فحاشی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ وی سی آر کی آمد کے بعد بڑے سنیما ہال شاپنگ سینٹرز میں تبدیل ہو گئے کیونکہ اب ہر گھر میں فلم دیکھی جانے لگی تھی۔ ضیاء الحق کے دور میں جب تک راجہ ظفر الحق وزیر اطلاعات رہے ٹیلیویژن کو کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اس زمانے میں خواتین نیوز کاسٹر کو سر پر دوپٹہ رکھنے اور مردوں کو واسکٹ اور شیروانی وغیرہ کا پابند کیا گیا۔ ڈراموں میں بھی مقصدیت تھی۔ فلموں کی ٹیلی کاسٹنگ بند کی گئی۔ البتہ ظلم یہ ہوا کہ وی سی آر جو اب تک چوری چھپے استعمال کئے جاتے تھے اس پر لائسنس فیس عائد کی گئی حالانکہ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ وی سی آر کے پروگرام میں حکومت کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وی سی آر عام ہو گیا۔ گلی گلی ویڈیو شاپس کھل گئے اور فاشی و عریانی پر مشتمل انڈین فلمیں عام ہو گئیں۔ ایسی فلموں پر سرکار کی طرف سے پابندی کے نتیجے میں یہ بزنس پولیس والوں کی سرپرستی میں آ گیا۔ گویا کہ ان کے لئے "فضل ربی" کا ایک اور دروازہ کھل گیا۔ لیکن اب بھی غریب اور نچلا اور متوسط طبقہ اس سیلاب بلا سے محفوظ تھا لیکن اب ایسے اقدامات کئے جا رہے ہیں کہ جس کے نتیجے میں کوئی گھر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے گا سوائے ان گھروں کے، جن کے مکین برائی کے خلاف عزیمت کا مظاہرہ کر سکیں۔ یہودیوں کی اس سازش کے آلہ کار بدقسمتی سے ہمارے اپنے نام نہاد حکمران بنے ہوئے ہیں۔ نام نہاد قاہرہ کانفرنس کی صدارت پاکستان کی ایک لیڈی ڈاکٹر کے حصے میں آئی تھی اور بیجنگ کانفرنس کے دوران ہماری وزیر اعظمی کی تقریر کو جس طرح عالمی ذرائع ابلاغ نے پذیرائی دی ہے وہ اس کا ثبوت ہے۔ اب قاہرہ کانفرنس کے ایجنڈے پر باقاعدگی سے عمل درآمد شروع ہو چکا ہے۔

پچھلے دنوں میری بچی جو ایک گورنمنٹ گرلز

> "نوجوان نسل جس کو شاعر مشرق علامہ اقبالؒ نے شاہین سے تعبیر کیا تھا، آج مغرب کے تہذیبی مردار پر کرگس بن کر بیٹھی ہے"

اسکول میں میٹرک کی طالبہ ہے، اسکول سے واپسی پر ایک "Leaf Let" لے کر آئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ پاپا آج اسکول میں چند عورتیں آئی تھیں جنہوں نے یہ "Leaf Let" تمام طالبات میں تقسیم کیا ہے۔ میں نے تو اسے نہیں پڑھا آپ دیکھ لیں یہ کیا ہے؟ یہ Leaf Let کسی نجی ادارے ایڈز انفارمیشن اینڈ ڈائیگناسز سروسز A-20 بلاک "L" نارتھ ناظم آباد پوسٹ بکس 18050 کراچی 74700 کی جانب سے تھا، جس کا عنوان "ایڈز کے خلاف جنگ۔ ایچ آئی وی ۔ ایڈز اور جنسی امراض کے بارے میں حقائق" ہے۔ اس کے چند ذیلی عنوانات یہ ہیں:

(i) HIV ایڈز کا مرض پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔
(ii) ایڈز کس طرح پھیلتی ہے؟
(iii) ایڈز ایک عالمی مسئلہ
(iv) جنسی ذرائع سے اس کے پھیلاؤ پر قابو پایا جا سکتا ہے
(v) خون کے ذریعہ اس کے پھیلاؤ پر قابو پایا جا سکتا ہے۔
(vi) ایڈز کا وائرس کس طرح منتقل نہیں ہو سکتا
(vii) ایڈز کے وائرس سے متاثر شخص کی دیکھ بھال اور ہمدردی
(viii) معلومات اور تعلیم کی افادیت
(ix) ایڈز پر لگائی جانے والی رقم سرمایہ کاری ہے۔
(x) اب عمل کا وقت ہے
(xi) ایڈز کے خلاف جنگ میں ہمارا ساتھ دیجئے

فوری طور پر چند سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں۔

(i) اس Leaf Let کو طالبات میں تقسیم کرنے کا سبب کیا ہے؟
(ii) اسکول کی انتظامیہ نے کس طرح متعلقہ خواتین کو اس Leaf let کو طالبات میں تقسیم کرنے کی اجازت دی؟

مقصد تو بالکل واضح ہے۔ قاہرہ کانفرنس میں جنسی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ ہمارے حکمران چونکہ ایک بزدل قوم یہود کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں لہٰذا یہ بزدلی ان میں بھی سرایت کر گئی ہے اور ان میں اتنی ہمت نہیں کہ باقاعدہ تعلیمی اداروں میں جنسی تعلیم کا آغاز کر سکیں لہٰذا اب اس طرح کے فیلرز چھوڑے جا رہے ہیں تاکہ لوگوں کے رد عمل کا جائزہ لیا جا سکے۔ چونکہ اس Leaf let کی تقسیم ایک سرکاری اسکول میں کی گئی ہے لہٰذا یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اسکول کی انتظامیہ پر حکومت کا دباؤ ہے

ورنہ ہمارے تعلیمی اداروں کی خواتین اساتذہ بے غیرتی کے اس مقام تک نہیں پہنچیں جہاں انہیں اپنی طالبات میں اس قسم کے لٹریچر کی تقسیم میں کوئی عار نہ ہو۔

میں نے چند ان مذہبی سیاسی علماء کو خط لکھا جو ایم این اے اور سینیٹرز کی حیثیت رکھتے ہیں' جس میں اس سازش کی طرف متوجہ کر کے ان کی دینی غیرت کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ مجھے یقین ہے کہ یہ سعی لاحاصل ہے۔ مراعات کے سونے کی زنجیروں میں اسیر یہ علماء اقتدار کی کشمکش سے باہر آ نہیں سکتے۔ نہی عن المنکر بالید جو اس کا واحد علاج ہے اس کے یہ وسائل نہیں رکھتے۔ پھر یہ بے چارے آج کل خود حکومت کے حملوں سے اپنی جانیں بچانے میں مصروف ہیں۔ ایک عالم دین جو فیڈرل شریعت کورٹ کے جج ہیں اور ایک کثیر الاشاعت روزنامہ میں اصلاحی کالم بھی لکھا کرتے ہیں' ان سے بھی شکایت کی ہے۔ میں نے اپنی بچی کو ہدایت کر دی ہے کہ آئندہ کوئی ایسا لٹریچر جس کا نصاب سے کوئی تعلق نہ ہو وہ لینے سے انکار کر دیا کرے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس "نوحہ" کو اپنے ہفت روزہ میں شامل کر دیں ممکن ہے میری طرح دوسرے والدین بھی اپنی اولاد کو بچانے کی فکر کریں۔

نہ صرف یہ کہ لٹریچر تقسیم ہو رہا ہے بلکہ یہ اطلاع بھی ملی کہ یہ خواتین طالبات میں ایڈز کے موضوع پر لیکچرز بھی دے رہی ہیں۔OO

محمد سمیع

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دنیا کے سرفہرست مسائل میں سب سے اہم مسئلہ "ماحولیاتی آلودگی" ہے۔ اس وقت دنیا بھر کے ممالک کی حکومتیں اس اہم مسئلہ سے نپٹنے کے لئے اپنے مالی وسائل کا بیشتر حصہ خرچ کر رہی ہیں۔ حکومتی کوششوں کے ساتھ ساتھ ان گنت غیر سرکاری تنظیمیں (NGO,S) بھی عوام الناس کو اس مسئلہ کی سنگینی سے باور کروانے کے لئے مصروف عمل ہیں۔ آج دنیا میں ہونے والی بیشتر کانفرنسوں' سیمناروں اور ریلیوں کا موضوع بھی ماحولیاتی آلودگی ہی ہے۔ آج پوری دنیا میں فضائی' آبی اور زمینی آلودگی کی شرح میں دن دوگنا اور رات چوگنا اضافہ ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی آلودگی کے اضافے کے شرح کے بارے میں ماہرین ماحولیات کا کہنا ہے کہ اگر اس کو کنٹرول نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کرہ ارضی پر زندگی کا کوئی امکان نہ رہے گا۔

لیکن وطن عزیز پاکستان کو آج ماحولیاتی آلودگی کے علاوہ بے حیائی' فحاشی و عریانی کی معاشرتی آلودگی سے بھی واسطہ ہے۔ بے حیائی' فحاشی اور عریانی کی آلودگی میں اضافہ کی شرح ماحولیاتی آلودگی سے دوگنی ہے اور اس کے اضافے کا سبب کارخانوں کی دھواں چھوڑتی چمنیاں اور بہنے والا مضر صحت فضلہ یا ٹریفک کے شور کا سیلاب اور دھواں نہیں بلکہ مختلف النوع اسباب ہیں' جن میں سرفہرست الیکٹرانک میڈیا یعنی ریڈیو' ٹیلی ویژن اور لاتعداد ڈش چینلز ہیں۔ آج ہمارے وطن کی ٹی وی اور ریڈیو نشریات بے حیائی' فحاشی اور عریانی کے ذریعے معاشرتی زندگی کو آلودہ کر رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر لچر اور بے ہودہ رومانوی ڈراموں اور فلموں کے ذریعے اور ریڈیو پر فحش اور مخرب الاخلاق موسیقی اور گانوں سے نوجوان نسل کے اخلاق کو تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ اس تباہی کی انتہا ڈش انٹینا ہے۔

الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا یعنی اخبارات و رسائل بھی اس آلودگی کا ایک اہم سبب ہیں۔ ہر روز اخبارات کے صفحات لچر اور بے ہودہ خبروں اور بدنام زمانہ خواتین یعنی اداکاراؤں کی عریاں تصاویر سے سیاہ ہوتے ہیں۔ اخبارات و رسائل آبرو باختہ خواتین کو نوجوان نسل کے لئے نمونہ بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

معاشرتی آلودگی میں اضافے یعنی "جلتی پر تیل کا کام" ہمارے تعلیمی ادارے (بالخصوص خواتین سکول اور کالجز) کر رہے ہیں۔ ان میں آئے روز منعقدہ ثقافتی پروگرام' ورائٹی شوز اور مینا بازار نوجوان مسلمان بچیوں کے اخلاق کی تباہی کا باعث ہیں اور ان مواقع پر لی گئی تصاویر کو خصوصی طور پر اخبارات کی زینت بنایا جاتا ہے۔ رہی سہی کسر سڑکوں اور بازاروں کے چوکوں میں تجارتی کمپنیوں کے لگے ہورڈنگ بورڈز اور سینماؤں کے عریاں پوسٹرز نے پوری کر دی ہے' جن پر خواتین کے انتہائی دلفریب انداز کی تصاویر ہوتی ہیں جو درحقیقت خواتین کی عزت نہیں بلکہ انتہائی ذلت کا باعث ہیں۔

مندرجہ بالا اسباب کے علاوہ ایک اہم سبب ہمارے ہاں کا مغرب پرست حکمران طبقہ ہے جو اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے ہم پر مغربی تہذیب کو ٹھونسنا چاہتا ہے' جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج نوجوان نسل دین سے دور اور مغربی تہذیب کے اتباع میں شرم و حیاء کی قبا کو چاک کئے ہوئے ہے۔ وہ نوجوان نسل جس کو شاعر مشرق علامہ اقبال" شاہین سے تعبیر کرتے تھے' آج مغرب کے تہذیبی مردار پر کرگس بن کر بیٹھی ہے۔

حالانکہ پوری دنیا اس حقیقت سے واقف ہے کہ مغربی معاشرہ بے حیائی اور فحاشی کی آلودگی کے ذریعے برائیوں کا متعفن ڈھیر بن چکا ہے۔ وہاں اخلاقی اقدار ناپید ہو چکی ہیں۔ مغرب کا خاندانی نظام تباہ و برباد ہو چکا ہے' انسانی رشتوں کا تقدس پامال ہو چکا ہے۔ عورت عیاشی کا ذریعہ اور اشتہار بن چکی ہے۔ نوجوان نسل شباب اور کباب کی رسیا ہو کر ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج ہو چکی ہے۔ اس کا حال جرائم اور خودکشی سے وابستہ اور مستقبل "ایڈز" کی نظر ہو چکا ہے۔ آج امت کا دشمن یہودی اپنے ذرائع ابلاغ کے ذریعے امت کے قلب یعنی نوجوان نسل کے بدن سے "روح محمد" نکالنے کے درپے ہے' اور وہ اپنے گھناؤنے مقاصد کو ثقافت کے روپ میں پیش کر رہا ہے' جبکہ یہ ثقافت نہیں بلکہ کثافت یعنی آلودگی ہے۔

ملک میں قائم ماحولیاتی کمیشن (جو کہ وزیر اعظمی کے شوہر نامدار کی سربراہی میں قائم ہے) کو جان لینا چاہئے کہ جس طرح ماحولیاتی آلودگی انسانی زندگی کے لئے خطرناک ہے' بالکل اس طرح بے حیائی' فحاشی اور عریانی پر مبنی معاشرتی آلودگی انسان کی روحانی اور معاشرتی زندگی کے لئے خطرناک ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کا شعور عوام کو بھی دلایا جائے۔

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

> "مراعات کے سونے کی زنجیروں میں اسیر یہ علماء اقتدار کی کشمکش سے باہر آ نہیں سکتے۔ نہی عن المنکر بالید جو اس کا واحد علاج ہے اس کے یہ وسائل نہیں رکھتے' پھر یہ بیچارے خود آج کل حکومت کے حملوں سے اپنی جانیں بچانے میں مصروف ہیں"

بقیہ : حکمتِ انقلاب

وقت تصادم تلوار سے ہوا تھا جبکہ آج کلاشنکوف سے ہو سکتا ہے۔ عصر حاضر میں تصادم کا ایک نیا طریقہ منظم افرادی قوت کا استعمال ہے۔ یعنی ایک منظم اور اخلاقی و روحانی لحاظ سے تربیت یافتہ جماعت نہی عن المنکر بالید کا فریضہ سرانجام دینے کے لئے میدان میں آئے' منکرات کے خلاف پرامن مظاہرے کرے' پکٹنگ کرے اور عوام کی حمایت حاصل ہونے پر بلوں اور ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر کے سسٹم کو جام کر دیا جائے۔ اس صورت میں باطل حکومت سے کشمکش اور تصادم ہو گا' لاٹھیاں چلیں گی' جیلیں بھری جائیں گی اور گولیاں ماری جائیں گی' جو منظم جماعت کے کارکن اپنے سینوں پر کھائیں گے مگر پرامن رہیں گے اور پیچھے نہ ہٹیں گے' جس کے نتیجے میں سسٹم جام ہو گا اور باطل حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ یہ انقلاب کا پانچواں طریقہ ہے جو سنت سے قریب تر ہے کیونکہ اس میں مداہنت نہیں ہے' تصادم ہے' شہادتیں ہیں اور کامیابی کے امکانات بھی ہیں۔ عصر حاضر میں نہ بیلٹ کا طریقہ کامیاب ہوا ہے نہ بلٹ کا۔ اگر دینی جماعتوں کو کوئی کامیابی حاصل ہوئی ہے تو اسی "احتجاجی طریقہ کار" سے۔ ایران کا انقلاب اسی طرح آیا۔ پاکستان میں قرار داد مقاصد' تحریک ختم نبوت' تحریک نظام مصطفےٰ اور شیعہ حضرات کا زکوٰۃ آرڈیننس واپس لینے کا مطالبہ اسی طریقے سے کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ حضورؐ کے زمانے سے لے کر اب تک جو تمدنی ارتقاء ہوا ہے اور جو نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے اس میں یہی طریقہ مفید اور کامیاب ہے' جو سنت سے بھی قریب ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے دینی جماعتوں کے اکابرین پاور پالیٹکس سے باہر آ کر پہلے اپنی متنازعہ حیثیت کو ختم کریں اور پھر حضورؐ کی سنت کے مطابق انقلابی خطوط پر جدوجہد کرتے ہوئے منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں OO

بقیہ : بدلتے افق

بہرحال بین الاقوامی معاملات میں سفارت کاری اور طاقت کے استعمال میں اندرونی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے' ہماری عالمی قیادت کی راہ میں جو اصل رکاوٹیں پیش آ سکتی ہیں وہ اس دنیا کا ملٹی پولر وجود ہے یعنی دنیا مختلف مراکز میں منقسم ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر افلاطون موجود ہے۔ ایسے لوگوں سے دنیا بھری پڑی ہے مگر کام کا ایک بھی شخص موجود نہیں۔ ایسی دنیا کی قیادت کوئی آسان کام ہے؟ امریکہ کی پہلے جیسی بالادست حیثیت قائم رکھنے کے لئے ایک حقیقی حریف درکار تھا۔ خوش قسمتی سے ۱۹۹۰ء کے بعد وہ اب دنیا میں کہیں نظر نہیں آتا۔ پرل ہاربر کے بعد پہلی مرتبہ امریکی عوام کو موقع ملا ہے کہ ملک کے مستقل مفادات کے بارے میں غور کریں اور سکون کے ساتھ اپنے اندرونی مسائل حل کرنے پر توجہ صرف کریں۔ عالمی معاملات میں مارک میڈش (Mark Medish) کے الفاظ میں ہمارا طرز یہ ہونا چاہئے کہ بالکل واضح طور پر یہ طے ہو کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور اس کے لئے کیا قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ صرف یہ کہنے سے کام نہیں ہو جاتا کہ یوں ہونا چاہئے اور یوں نہیں ہونا چاہئے۔ بلند بانگ دعوے کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہئے اور نہ دوسروں کو۔ اس میں قطعاً کوئی برائی یا اخلاقی جرم نہیں کہ ناقابل عمل وعدوں کی بساط لپیٹ کر حقیقت پسندی' خود انحصاری اور دوسروں کے ساتھ تعاون کی راہ اپنائی جائے۔ اس سے نہ تو خدمت خلق کے مواقع ہمارے ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ ہے اور نہ ہی امریکہ کے ہاتھ بندھ جائیں گے کہ آئندہ ضرورت کے تحت طاقت کا استعمال نہ کیا جا سکے۔OO

بقیہ : افہام و تفہیم

یہ بات بالکل صحیح ہے ہم تمام دینی جماعتوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں' اس لئے کہ ہمارے نزدیک انتخابات سے اسلامی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ جماعت اسلامی ہماری مخاطب خاص اس لئے ہے کہ یہ واحد جماعت ہے جو اپنی فکری اصل اور نوعیت کے اعتبار سے انقلابی جماعت ہے۔ پاکستان کی باقی تمام جماعتیں کسی مسلکی و فقہی مکتب فکر کی نمائندہ ہیں۔ اس تاریخی پس منظر کے اعتبار سے ہم محترم خرم صاحب کے ذریعے جماعت اسلامی کو ایک بار پھر اپنی پالیسی پر نظر ثانی کا مشورہ دیں گے۔OO

جلسۂ استقبال رمضان

برائے خواتین

نیکیوں کے موسم بہار' رمضان المبارک' کی آمد پر ذہنی تیاری کے لئے

حلقہ خواتین تنظیم اسلامی (لاہور) کے زیر اہتمام

بدھ' ۱۷ جنوری ۱۹۹۶ء کو صبح ساڑھے نو تا ایک بجے دوپہر

ایک اجتماع عام منعقد کیا جا رہا ہے

ان شاء اللہ

اس موقع پر امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد بھی خطاب فرمائیں گے

مقام : قرآن آڈیٹوریم' ۱۹۱۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن

تمام خواتین کو شرکت کی عام دعوت ہے

نوٹ : رفیقات تنظیم اسلامی سے درخواست ہے کہ وہ اپنی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ اس پروگرام میں وقت کی پابندی کے ساتھ شرکت کریں

المعلنہ : بیگم ڈاکٹر اسرار احمد' ناظمہ حلقہ خواتین تنظیم اسلامی پاکستان

مرکزی دفتر : ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

جمہوریت

ضیاءاللہ۔ گوجرہ

خواہ وہ ابرار ہیں ' یا وہ فجار ہیں
خواہ وہ اخیار ہیں' یا وہ اشرار ہیں
پیرِ مکتب ہیں یا طفلِ بازار ہیں
ووٹ میں سب برابر کے حقدار ہیں

◆

پاس ہو جس کے دولت الیکشن لڑے
اہلِ ثروت ہی ہوتے ہیں اس میں کھڑے
حصہ لیتے ہیں بس لوگ اس میں بڑے
جن کے آگے ہیں سب لوگ اوندھے پڑے

◆

مان لو اس کو تم سو گدھے جو کہیں
ایک دو ہوں جو انسان' وہ چپ رہیں
اکثریت کی رائے کو سب مان لیں
فیصلے ان کے جی میں جو آئیں کریں

◆

اب خدا کی رضا کا نہیں کوئی کام
فیصلے جو بھی چاہیں کریں خود عوام
اکثریت جو لے آئے باطل نظام
تو ہے لازم' کریں اس کا سب احترام

یہ غریب اور مفلس بھی انسان ہیں
جو مسائل سے اپنے پریشان ہیں
ان کے دل میں بھی جینے کے ارمان ہیں
جن پر قابض مگر کچھ "ہنومان" ہیں

◆

سب امیروں کے پروردہ دستور ہیں
جن سے بیزار دہقان و مزدور ہیں
یہ بساطِ سیاست سے سب دور ہیں
جبکہ یہ لوگ ہی اصل جمہور ہیں

◆

دین سے کر رہا ہے یہ پہلو تہی
ہم سے کہتا ہے مغرب زدہ مولوی
کہ ہے بنیاد جمہوریت دین کی
ہے جو کفر بواح اور شرک جلی

◆

کیا یہ سب جھوٹ ہے' بولتے کیوں نہیں؟
کرسیوں کے خدا ' ڈولتے کیوں نہیں؟
رمز پنہاں ضیاء' کھولتے کیوں نہیں؟
گنتی کرتے ہیں کیوں ' تولتے کیوں نہیں؟

○ ○

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

گاہے گاہے باز خواں ۔۔۔۔

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ!

گاندھی مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی بات پر تلملا اٹھے

کیا انڈین نیشنل کانگرس مسلمانوں کے مفادات کی محافظ جماعت تھی؟

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی کے درمیان اگست ۱۹۴۵ء میں ہونے والی خط و کتابت

گاندھی کے نام ۲/ اگست کے اپنے توضیحی خط میں مولانا ابوالکلام آزاد" لکھتے ہیں کہ کانگریس کو ایسے ذرائع تلاش کرنے ہوں گے، جنہیں بروئے کار لا کر مسلمانوں کے شکوک و شبہات کو رفع کیا جا سکے نیز مسلمانوں کے بارے میں کانگریس کی پالیسی حتمی ہونی چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں میرے نزدیک ایک ثالثی کمیٹی کا قیام مناسب ہو گا لیکن ابتدا مسلم لیگ سے باہر کی مسلمانوں کی تمام تنظیموں کو یکجا ہو کر مستقبل کے دستور کے بارے میں اتفاق رائے پیدا کرنا ہو گا۔ اس کے بعد کانگریس کو چاہئے کہ اسے قبول کرتے ہوئے کھلے دل سے ان تنظیموں کا ساتھ دے۔ خط کے ساتھ بطور یادداشت انہوں نے بعض تجاویز شامل کی تھیں جن کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ یہ تجاویز بالکل ذاتی حیثیت میں پیش کر رہے ہیں، نہ کہ بطور صدر کانگریس۔

یادداشت کے تعارفی پیرے میں فرقہ واریت کے وجود کا اقرار کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ اس کے اسباب کی کھود کرید کرنے اور ایک دوسرے پر الزام دھرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو خدشات لاحق ہیں وہ صرف اسی صورت میں رفع ہو سکتے ہیں کہ ایک ایسی سکیم سامنے لائی جائے جس کے تحت وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس کریں۔ اگر وحدانی طرز حکومت قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ کامیاب نہیں ہو گی۔ ملک کی تقسیم بھی ناکام ثابت ہو گی بلکہ اس سے خود مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ ایک ہندوستانی مسلمان ہونے کے ناطے مولانا آزاد نے تقسیم کے فارمولے کو شکست خوردگی کی علامت قرار دیتے ہوئے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد انہوں نے یادداشت میں اپنا مجوزہ خاکہ تحریر کیا تھا جو کچھ یوں ہے گا :

(ا لف) ہندوستان کا مجوزہ آئین وفاقی ہو جس میں اکائیاں مکمل طور پر خود مختار ہوں۔ مرکز کے پاس صرف ایسے کل ہند نوعیت کے امور رہیں جن پر وفاق میں شامل اکائیاں راضی ہوں۔

(ب) کوئی اکائی اگر وفاق سے علیحدگی اختیار کرنا چاہے تو اسے آئینی طور پر اس کا حق حاصل ہونا چاہئے۔

(ج) مرکز اور صوبوں دونوں کے انتخابات مخلوط

> "آپ کے خط سے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کا اشارہ میری ہندو قوم کی طرف ہے۔ آپ کے دل میں جو کچھ بھی ہے کم از کم آپ کے خط سے اس کا اظہار نہیں ہو سکا"

بنیادوں پر ہوں لیکن ساتھ ہی مختلف طبقات کو نمائندگی دینے کے لئے نشستیں مخصوص کرنے اور ضرورت کے تحت امتیازی حق رائے دہی کا اہتمام کیا جائے۔

(د) جب تک طبقاتی شکوک و شبہات دور نہیں ہو جاتے اور معاشی اور سیاسی لائنوں پر جماعتیں وجود میں نہیں آتیں، مرکزی دستوریہ اور منتظمہ میں ہندو اور مسلمانوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہو۔

(ر) باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیا جائے کہ شروع کے کچھ عرصے کے لئے ہندوستانی وفاق کا سربراہ ہندو اور مسلمان باری باری ہو گا۔ (ختم شد)

اس ابتدائی خاکے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ملک کی یکجہتی کے لئے مضبوط مرکز کا ہونا ضروری نہیں جیسا کہ سوویت یونین کی مثال سامنے آئی ہے۔ صوبوں میں مخلوط انتخابات ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے قابل قبول ہو سکتے تھے کیونکہ اکثریتی طبقے کے لئے اس میں تشویش کا کوئی پہلو نہیں جبکہ اقلیتی طبقے کو یہ اطمینان ہو تا کہ اسے اکثریتی فیصلے پر اثر انداز ہونے کی حیثیت حاصل ہو گی۔ مسلمانوں کو مرکز میں مخلوط انتخابات سے خوف ہو تا لیکن دستوریہ اور منتظمہ میں مساوات اور صوبوں کے پاس علیحدگی کا حق ہونے سے اس خوف کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ مولانا آزاد کو یقین تھا کہ مسلمان ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو ان کی تجاویز قبول کر لیں گے۔

یادداشت کے آخر میں مولانا آزاد نے اپنے ہندو دوستوں سے اپیل کی تھی کہ وہ اس بات کا فیصلہ مسلمانوں پر چھوڑ دیں کہ وہ ہندوستان کے مستقبل کے آئین میں اپنے لئے کیا منصب منتخب کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو اگر یہ اطمینان ہوا کہ ان پر غیر مسلموں کی طرف سے اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی جا رہی تو وہ تقسیم کے مطالبہ سے دستبردار ہو کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ ان کے مفادات ایک متحدہ ہندوستان کے وفاق میں زیادہ محفوظ ہیں۔

لگتا ہے مولانا آزاد کو اس بے چینی اور خوف کا سامنا تھا کہ کانگریسی لیڈروں نے اگر اپنا وطیرہ نہ بدلا تو

(باقی صفحہ ۱۵ پر)